اردو سبھا

مجموعہ مضامین مرتبہ پرتاپ اردو سبھا سری پرتاپ کالج سری نگر

1942

قیمت ایک روپیہ

فہرس

مدعا کیا ہے

آج کل بہت سی بلند مرتبہ ادبی مجلسیں کتابوں اور رسالوں کی صورت میں شمالی ہندوستان کی قومی زبان کی ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ کشمیر سے سری پرتاپ کالج کی "پرتاپ" اردو سبھا اپنا ہدیہ لیکر اُن کی صف میں جگہ تلاش کرنے کی جرأت کر رہی ہے۔ شاید یہ کوشش حوصلہ افزا نگاہوں کا مرکز بن سکے۔

کشمیر خود اپنی ایک مستقل زبان رکھتا ہے اور اس زبان میں قابل توجہ لٹریچر بھی موجود ہے مگر ان خاص حالات میں جبکہ کشمیر اپنے حسن و جمال کی وجہ سے باقی ہندوستان کا بہترین حصہ سمجھا جاتا ہے اور اس حیثیت سے اسکے اور صوبوں سے حصوں سے گہرے تعلقات ہیں ہمیں ضرور اس زبان کو اپنانا ہوگا جو ہمیں باقی ہندوستان کے ساتھ ملائے اور جس سے ہماری صنعت، و حرفت اور تجارت کو فروغ حاصل ہو۔ ہر سال ہزاروں سیاح کشمیر کی سیر کے لئے تشریف لاتے ہیں۔ ان مہمانوں کی زبانیں جدا جدا ہوتی ہیں اور وہ کشمیری زبان نہیں جانتے۔ یہ بھی حد امکان سے دور نہیں کہ مستقبل میں کشمیر گرمی کے موسم میں ایسی تمام مجلسوں اداروں اور تحریکوں کا مرکز بنے جو کل ہند حیثیت رکھتی ہوں اور یورپ میں جو درجہ سوئٹزرلینڈ کو حاصل ہے وہ کشمیر کو ہندوستان کے "براعظم" میں ملے۔ ان حالات کا صحیح صحیح جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دو ہی ایسی زبانیں ہیں جو ہماری ضرورت کو پوری کر سکتی ہیں :- اردو اور انگریزی

انگریزی زبان سے بغیر کسی قسم کی مخالفت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ قریب مستقبل میں ملک کی تمدنی اور معاشرتی زندگی میں اس کا درجہ موجودہ حالت سے بہت کم ہوگا۔ ہندوستان کے اور صوبوں کی طرح کشمیر میں جو وقت طلبا انگریزی زبان اور ادب پر عبور حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں اس سے کہیں کم اردو سے شناسا بننے کے لئے مقرر ہے۔ خواجہ غلام السیدین صاحب کے وہ الفاظ جو انہوں نے پرنس آف ویلز کالج کے جلسۂ تقسیم اسناد میں کہے ہماری صحیح رہنمائی کرتے ہیں۔

"عام طور پر طلبہ کو کالجوں اور ہائی سکولوں میں ایک غیر زبان کے ذریعہ تعلیم دینا ان کی جدت اور ان کے تخلیقی سوتوں کو بند کر دینا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے علمی معیار کو اونچا کریں اور ہندوستانی ادب دنیا کے بہترین ادب کا مقابلہ کر سکے تو ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم اپنی زبانوں کی سچی قدر کریں۔ محبت اور دلسوزی کے ساتھ ان کی خدمت کرنا سیکھیں"

انہیں جذبات کے زیر اثر پرتاب اردو سبھا کی تشکیل پچھلے سال کالج میں ہوئی۔ مگر یہ سچ ہے کہ کسی سبھا یا مجلس کا محض قائم ہونا اُسکی ترقی یا فائدہ رسانی کا ثبوت نہیں ہو سکتا اسکے لئے ایک ایسی قوت کا ہونا اشد ضروری ہے جو اس کے کل پرزوں میں حرکت پیدا کرے۔ پرتاب اردو سبھا کی خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر تاثیر کا علم اور تجربہ اس کے لئے ایسی قوت ثابت ہوا۔ طلبا کی دلچسپیوں کو صحیح اور مفید راستوں پر چلانے کے لئے انہوں نے تجویز کی کہ "پرتاب اردو سبھا" اپنے مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کرے جن میں اہل قلم حضرات کے ایسے مضامین فراہم کئے جائیں جو طلبا اور مبتدی حضرات کے لئے نثر اور نظم میں عمدہ نمونے ثابت ہوں

ہمارے کرم فرما اور اُن کی عنایات

جب کسی غریب آدمی کے گھر خوشی کا موقعہ ہوتا ہے تو اس کے آسودہ حال دوست اپنی زینت اور آرائش کی قیمتی چیزیں اس کے گھر بھیج دیتے ہیں تاکہ اس خوشی کے موقع کو پر رونق بنایا جائے۔ ایسے ہی اس موقع پر ہم لوگوں کو جو کہ اردو زبان کے اعزاز میں خوشی منا رہے تھے ہمارے ان کرم فرماؤں نے جنہیں کشمیر سے گہری وابستگی ہے۔ اپنے نہایت ہی نایاب اور قیمتی مضامین اعلیٰ پایہ کی نظمیں اور غزلیں "اردو سبھا" کو مزین کرنے کے لئے روانہ کیں۔

ہمارے کرم فرما کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ مگر ہم اپنی عزت افزائی کے لئے ان کے نام گنواتے ہیں

تنقیدی حصہ

"میر تقی میر" - میرزا جعفر علی خان صاحب اثر نے "اردو سبھا" کی کامیابی میں جو حصہ لیا ہے وہ عیاں ہے۔ میرزا صاحب کے اپنے کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر تقی میر کے کلام کے ساتھ انہیں والہانہ محبت ہے اور ان کی بہت سی غزلیں اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ اپنے ایک پسندیدہ شاعر سے عقیدت کا اظہار اس سے بہتر اور کیسے ادا ہو سکتا ہے کہ لوگوں میں میر کے کلام کے ساتھ صحیح دلچسپی پیدا کی جائے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس مضمون کی سب سے اعلیٰ خوبی جس سے آپ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے وہ زبان کی شیرینی اور طرز بیان کی ندرت ہے۔ اردو نثر میں اس سے بہتر نمونے ملنے آسان نہیں

"کلامِ اقبال"

علامہ اقبال کے کلام کے ساتھ اُن کو مداحوں کو والہانہ عشق ہے اور ان کی تعریف ایسے الفاظ میں کی جاتی ہے جن پر اندھی مداحی کی پھبتی کسی جا سکتی ہے۔ ایسی غیر متوازن تعریفوں کا ردعمل ظہور میں آنا غیر متوقع نہیں ہوسکتا۔ آپ کو ایسے اشخاص بھی ملیں گے جو اس عظیم الشان شاعر کے خلاف معترضین کی صف میں شامل ہونا فخر سمجھتے ہوں۔ افسوس اس بات پر ہے کہ یہ دونوں گروہ تعصب کی بنا پر صحیح خوبیوں کو عوام کی نظروں سے اوجھل کر دینے کے ذمہ دار ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ کلامِ اقبال پر چند مروجہ اعتراضات کو مشہور ادیبوں کی خدمت میں بھیجا گیا۔ ہمارے اس التماس کو عام طور پر قابل پذیرائی نہیں سمجھا گیا۔ مگر ہم خوش نصیب ہیں کہ بالکل ٹھکرائے نہیں گئے۔

میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر ہمایوں اور ڈاکٹر تاثیر نے ہماری عرضداشت کو قبول کیا۔ اور جوابات ارسال فرمائے۔

نظمیں

ہماری موجودہ شاعری پر انگریزی شاعری کا اثر نمایاں طور پر ہو رہا ہے۔ غزل کے بعض فرسودہ خیالات اور طرز بیان سے انہیں تاثرات نے ہمیں نجات کی صورت دکھائی ہے۔ ان تاثرات کو طلبا تک پہنچانے کے لئے عمدہ نظموں کے تراجم دلپسند صورت پیش کرنا نہایت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔
ہماری خوش قسمتی ہے کہ ایڈون مارکھم (Edwin Markham) کی شہرۂ آفاق نظم "دی مین وِتھ دی ہو" (The man with the Hoe) کا ترجمہ میرزا جعفر علیخان صاحب کے قلم سے پیش کیا جا رہا ہے۔ "بلینک ورس" (Blank verse) کا نمونہ جو میرزا صاحب پیش کر رہے ہیں۔ غالباً اردو نظم کی تاریخ میں سنگِ میل کا کام دے گا۔ اصوات کا تنوع قافیہ کی غیر موجودگی کو محسوس نہیں ہونے دیتا اور یہی بے قافیہ نظم کی کامیابی کا صحیح معیار ہے!

ابوالاثر حفیظ جالندھری کا "تحفہ" بہار پر ہمارے حوصلہ افزائی کے لئے گراں قدر عطیہ ہے۔ ایسے باکمال ادیب کی غیر مطبوعہ نظم کا چھپ کے ایک ادارے کو دستیاب ہونی معمولی بات نہیں۔

حضرت روش صدیقی صاحب کی نظم "کوثر کشمیر" آپ نے شاید ریڈیو پر سنی ہوگی۔ صفحۂ قرطاس پر اطمینان سے لطف اندوز ہونے کا موقع دینا اُن کی نوازش ہے۔ یہ نظم بھی غیر مطبوعہ ہے۔

خواجہ عبدالسمیع پال اثر صہبائی نے اپنی نظم ارسال فرما کر اُن تعلقات کی یاد کو تازہ کیا ہے جو اُن کے کشمیر میں کئی سال کے قیام سے کالج کے ساتھ پیدا ہوئے تھے۔

جناب جعفر تمیمی صاحب کی نظم "ہاتھ کی روانی" کے لئے بھی ہم بے حد شکر گذار ہیں۔ اردو میں مزاحیہ نظموں کی کمی ہے۔ جعفر تمیمی نے ہمارے مجموعہ کو "زعفران زار" بنا دیا ہے۔

مؤرخ کشمیر منشی محمد دین صاحب فوق نے مشہور کتاب تاریخ اقوام کشمیر اور دیگر تاریخی مضامین لکھ کر کشمیر کی نہایت قابل قدر خدمت سرانجام دی ہے۔ ان کا مضمون "سنہ لوکک اور کشمیری سن" اُن کی محنت اور تحقیق کا نمونہ ہے۔

جناب عبداللہ قریشی صاحب ہندوستان کے مختلف ادبی رسالوں میں مضمون لکھتے رہتے ہیں۔ انہیں کشمیر کے ساتھ گہری دلچسپی ہے۔ اور ان کا تحفہ "کشمیر ۱۸۴۶ء میں" شکریہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔

چونکہ جناب پرنسپل صاحب اور منتظمین پرتاپ اردو سبھا کی یہ خواہش ہے کہ وہ کالج کے طلبا میں صحیح علمی اور تحقیقی ذوق پیدا کریں اس لئے آپ اس مجموعہ میں چند افسانوں کے ترجمے اور ایسے تحقیقی مضامین بھی ملاحظہ فرمائیں گے جو کہ ہمارے کالج کے بعض ہونہار طلبا کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ اس مجموعہ میں اساتذۂ کالج کے کچھ مضامین اور نظمیں بھی شامل ہیں۔ ان کے متعلق ہم اس کے سوا اور کچھ نہیں کہتے کہ اگر ان میں کوئی کمی ہے تو وہ شوق کی پستی کی وجہ سے نہیں۔ شاید ہمت کی بلندی کی وجہ سے ہو۔ ! ہم سب طلبہ اور اساتذہ اپنی قومی زبان کے خدمتگار ہیں ! اور ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہمارا ملک عام فرقہ دارانہ تعصب سے ابتک بالا رہا ہے !

اخیر میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر جناب آنریبل ہوم منسٹر مرزا جعفر علیخاں صاحب کی حوصلہ افزائی پرتاپ میگزین کمیٹی کی دریا دلی اور مرزا کمال الدین شیدا سکریٹری میونسپل کمیٹی کی ادب پروری ہمارے شامل حال نہ ہوتی تو ہم یہ مجموعۂ مضامین آپ کی خدمت میں پیش نہ کر سکتے۔

ادارہ

مرزا جعفر علیخان صاحب اثر

میر تقی میر

مقدمہ

میر کا کلام انمول جواہر کا ایسا گنجینہ ہے جس سے ہر اہل نظر بقدر ذوق فیض اور لذت اٹھا سکتا ہے سوال صلاحیت کا ہے، ورنہ ؎

نعمت رنگا رنگ حق سے بہرۂ بخت سیہ کو نہیں
سانپ ہے ناگو گنج کے اوپر، کھانے کو تو کھائی خاک (میر)

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عام طور پر لوگ میر کے مطالعہ کی زحمت کم گوارا کرتے ہیں اور بعض اُن [illegible] کی بنا پر جو زبان زد ہیں رائے قایم کر لیتے ہیں کہ اُنکے یہاں سادگی و سلاست، درد و خستگی ہے بس۔ ایک صاحب کا ارشاد ہے کہ میر کے کلام میں انداز بیان کی دل آویزی تو ہے مگر تخیل کی رفعت اگر مفقود نہیں تو کمیاب ضرور ہے! بعض کا خیال ہے کہ اُنکے ضخیم دواوین میں کل ۷۲ نشتر قابل [illegible] ہیں باقی کلام تبرک ہے! حالانکہ ؎

میر دریا ہے، سنے شعر زبانی اُسکی
اللہ اللہ طبیعت کی روانی اسکی

میں نے میر کی شاعری پر نہ معلوم کتنے مضمون مختلف پہلوؤں سے لکھے اور اسکو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ شاید ایک حد تک کامیاب بھی ہوا۔ کیونکہ اکثر باتوں کو دوسروں نے اپنا لیا اور اس بے تکلفی سے کہ میرا حوالہ دینے کی بھی زحمت گوارا نہ فرمائی۔ اظہار پسندیدگی کا یہ طریقہ مستحسن نہ سہی ہمت افزا ضرور ہے۔ کیونکہ میر کے متعلق "سخنہائے گفتنی" کا ذخیرہ ختم نہیں ہو گیا ہے۔ ایک سعی اور سہی،

میر ایک فن کار کی حیثیت سے شاعری میں جن اصول کا پابند تھا اسکی وضاحت اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں کر دی ہے۔ جسکا خلاصہ یہ ہے۔ "جاننا چاہئے کہ ریختے کے چند اقسام ہیں اُن میں سے فقیر کو جنکا علم ہے بیان کرتا ہے۔

اوّل۔ ایک مصرع فارسی اور ایک مصرعہ ہندی جس کی مثال وہ قطعہ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کا ہے جو درج ہو چکا ہے۔

زرگر پسرے چو ماہ پارا   کچھ گھڑیے سنوارئے پکارا

نقد دل من گرفت و شکست   پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

دوم - آدھا مصرع ہندی اور آدھا فارسی، جیسا کہ میر معزؔ کا شعر -

از زلف سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے   در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

سوم - حرف و فعل فارسی لائے جائیں - یہ قبیح ہے -

چہارم - فارسی ترکیبیں استعمال کرتے ہیں - جو ترکیبیں زبان ریختہ کے موافق ہیں وہ اُن کا امر جائز ہے - اسکی تمیز غیر شاعر نہیں کر سکتا - جو تراکیب نا مانوس ہیں ریختے کے لئے معیوب ہیں، اسکی شناخت سلیقۂ شاعری پر موقوف ہے - فقیر کا مسلک بھی یہی ہے - اگر فارسی ترکیب گفتگوے ریختہ کے موافق ہے تو مضائقہ نہیں -

پنجم - ایہام کہ شاعران سلف میں اسکا رواج تھا اب اس صنعت کی طرف رغبت کم ہے جبتک نہایت شستگی کے ساتھ نظم نہ ہو - ایہام اس لفظ کو کہتے ہیں جس پر بیت کی بنیاد ہو اور اس لفظ کے دو معنی ہوں ایک قریب اور ایک بعید - شاعر کا مقصود مفہوم بعید ہو اور قریب متروک -

ششم - "انداز" ہے اور وہ ہم لوگوں نے اختیار کیا ہے اور وہ تمام صنائع پر محیط ہے، تجنیس، ترصیع، تشبیہ، گفتگو کی صفائی، فصاحت، بلاغت، ادا بندی، خیال وغیرہ یہ سب اسی ضمن میں آجاتے ہیں - فقیر بھی اسی وتیرے سے خوش ہے - جو اس فن میں طرز خاص کا مالک ہے میرا مطلب سمجھتا ہے - عوام سے مجھ کو سروکار نہیں - میرے احباب کے لئے میرا قول سند ہے، ہر شخص کیلئے نہیں کیونکہ میدان سخن وسیع ہے اور چمنستان ظہور کا تلوّن آشکار ہے - ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ایسا ذکر میر سے جسمیں انکے خود نوشتہ حالات ہیں اور جس سے اُن کی شاعری پر روشنی پڑیگی چند اقتباسات پیش کرتا ہوں -

میر صاحب کے بزرگ حجاز سے پہلے دکن آئے - وہاں بھی زمانہ نامساعد رہا تو احمد آباد گجرات کا رخ کیا - بعض وہیں رہ گئے اور بعض دیگر اطراف میں منتشر ہو گئے - چنانچہ میر صاحب کے جد اعلیٰ نے اکبر آباد (آگرہ) کو اپنا وطن بنایا - اُن کے ایک صاحبزادے نے گوالیار کا قصد کیا - اور وہیں انتقال کیا - یہ میر صاحب کے دادا تھے - اُن کے دو صاحبزادے تھے، بڑے خلل دماغ سے خالی نہ تھے اور جوان مر گئے - چھوٹے صاحبزادے نے جو میر صاحب کے والد تھے ترک دنیا کر کے درویشی اختیار کی - علوم ظاہری کہ جنکے بغیر عالم باطن تک رسائی دشوار ہے شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی سے تحصیل کئے - ان بزرگ کا شمار اس جوار کے اولیائے کاملین میں تھا - ریاضت شاقہ نے باطن کا رستہ کھول دیا - ترک

تجرید میں سعیٔ بلیغ کی اور تکالیف برداشت کیں۔ اُن بزرگ (شاہ کلیم اللہ) کی رہنمائی میں درویشی کی منزل میں داخل ہوئے۔

میر صاحب کے والد جوان صالح و عاشق پیشہ تھے، پہلو میں دل پر گداز رہتے تھے۔ علی متقی کے خطاب سے ممتاز ہوئے۔ اگر کسی وقت استغراق و مجاہدہ سے فارغ ہوتے اور طبیعت شگفتہ ہوتی تو فرزند کو نصیحت کرتے کہ بیٹا عشق اختیار کر۔ عشق ہی کارخانۂ عالم میں متصرف ہے، اگر عشق نہ ہوتا تو نظم کُل کی تشکیل نہ ہوتی۔ بے عشق زندگانی وبال ہے، دل باختۂ عشق ہونا تکمیل حیات ہے۔ عشق ساز بھی ہے اور سوز بھی — عالم میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے۔ آگ سوز عشق ہے، پانی رفتار عشق ہے، خاک قرار عشق ہے، ہوا اضطرار عشق ہے، موت عشق کی مستی ہے، حیات عشق کی ہوشیاری ہے، رات عشق کا خواب ہے۔ دن عشق کی بیداری ہے۔ مُسلم، عشق کا جمال ہے۔ کافر، عشق کا جلال ہے۔ صلاح و تقوٰی قرب عشق ہے، گناہ بُعد عشق ہے۔ بہشت عشق کا شوق ہے، دوزخ عشق کا ذوق ہے، مقام عشق عبودیت، عارفیت، زہد و صدیقیت، خلوص و شوق و خلیلیت و حبیبیت سے برتر ہے۔ ایک جماعت کا گمان ہے کہ آسمانوں کی حرکت حرکتِ عشقی ہے، یعنی مطلوب کو نہ پہنچے اور سرگرداں ہیں۔ بے عشق نہ رہنا چاہئے، بے عشق جینا بے معنی ہے۔ پیمبر کنعاں کو اپنے لڑکے کا عشق تھا۔

میر صاحب کے متعدد اشعار ہیں جن میں انہیں خیالات کو نظم کردیا گیا ہے۔ مثلاً ؎

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو — سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق معشوق، عشق عاشق ہے — یعنے اپنا ہی مبتلا ہے عشق

ع‌سہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے ذکر میر کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے کہ لفظ خطاب سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید اصلی نام کچھ اور ہو۔ پھر فرماتے ہیں کہ ساری کتاب میں کہیں اسکا اشارہ تک نہیں کہ سوائے اسکے انکا کوئی اور نام بھی تھا۔ میں بادب ذکر میر کے صفحہ ۶۲ کی طرف توجہ دلاتا ہوں جہاں یہ عبارت واقع ہے:۔

"خواجہ محمد باسط کہ برادرزادۂ صمصام الدولہ امیرالامرا بود عنایتے بحال من کرد و پیش نواب برد۔ چوں مرا دید پرسید کہ ایں پسر از کیست؟ گفت از میر محمد علی است۔ فرمود از آمدن ایں پیداست کہ ایشاں از جہاں رفتہ باشند۔ پس از افسوس بسیار سخن زد کہ آں مرد بر من حقہا داشت۔ یک روپیہ روز از سرکار من بایں پسر میدادہ باشند۔"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ میر صاحب کے والد کا نام میر محمد علی تھا۔ ریاضت و جہادِ نفس کے باعث اُن کو لوگ متقی کہنے لگے۔ پہلے محمد علی "متقی" کہتے ہونگے۔ رفتہ رفتہ علی متقی کہنے لگے۔ اور امتداد زمانہ نے خطاب کو نام کا جز بنا دیا۔

عشق ہے طرز و طور عشق کے تئیں کہیں بندہ، کہیں خدا ہے عشق
کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق حق شناسوں کا ہاں خدا ہے عشق
اور تدبیر کو نہیں کچھ دخل عشق کے درد کی دوا ہے عشق
کون مقصد کو عشق بن پہنچا آرزو عشق، مدعا ہے عشق
نزدیک عاشقوں کے زمیں ہے مزار عشق اور آسماں غبار سر رہگذار عشق

عشق سے نظم ہے، یعنی، عشق ہے کوئی ناظم خوب
ہر شئی یاں پیدا جو ہوئی ہے موزوں کر لایا ہے عشق

عشق ہے باطن اس ظاہر کا، ظاہر، باطن، عشق ہے سب
عشق اُدھر ہے عالم بالا اور ادھر دنیا ہے عشق

دائر سائر ہے یہ جہاں میں، جہاں تہاں متصرف ہے
عشق کہیں ہے دل میں پنہاں اور کہیں پیدا ہے عشق

موج زنی ہے میر فلک تک، ہر لجہ ہے طوفان زا
سرتاسر ہے تلاطم جسکا وہ اعظم دریا ہے عشق

ارض و سما میں عشق ہے سارا، چاروں اور بھرا ہے عشق
ہم ہیں جناب عشق کے بندے. نزدیک اپنے خدا ہے عشق

ظاہر باطن، اول آخر، پائیں، بالا، عشق ہے سب
نور و ظلمت، معنی و صورت، سب کچھ آپی ہوا ہے عشق

ایک طرف جبریل آتا ہے، ایک طرف لاتا ہے کتاب
ایک طرف پنہاں ہے دلوں میں، ایک طرف پیدا ہے عشق

خاک و باد و آب و آتش سب ہیں موافق اپنے تئیں
جو کچھ ہے سو عشق یہاں ہے، کیا کہئے اب کیا ہے عشق

میر صاحب کے والد دن کو کھوئے ہوئے سے رہتے تھے، شب عبادت میں بسر کرتے تھے۔ اکثر خاک پر سر بسجود، ہمیشہ مست شوق و پاکدامن، چہرے سے نور برستا تھا۔ ایک آفتاب تھے۔ جو اپنے سائے سے گریزاں تھا ؂

تجرید کا فراغ ہے اک دولت عظیم
بھاگا جو اپنے سائے سے، ہے خوش تر آفتاب (میر)

جس وقت ہوش میں ہوتے تو فرماتے کہ بیٹا عالم کی حقیقت ایک ہنگامے سے زیادہ نہیں، اس سے دل نہ لگانا، عشق الٰہی اختیار کر۔ خدا سے لو لگا۔ آخرت کی فکر لازم ہے۔ یہ جہاں گزشتنی ہے۔ اور زندگی وہم ہے۔ وہم کے پیچھے دوڑ نا پانی کو رسی سے باندھنا ہے۔ دنیا کی خواستگاری مہتاب کو گز سے ناپنے کی سعی ہے۔ چل چلاؤ لگا ہے۔ بے خبر نہ رہ، زادراہ کی فکر ضرور ہے۔ ورنہ منزل تک رسائی معلوم۔ اس سے رجوع کر عالم جس کا آئینہ ہے۔ اختیار اس کو سونپ دے جسکو اپنے ہی اندر ڈھونڈتے ہیں۔ اگرچہ مقصود حاصل ہے۔ پھر بھی طلب شرط ہے۔ "ہمہ اوست" سچ ہے مگر ادب شرط ہے۔ خلق کے ساتھ حق کی معیت جسم کے ساتھ روح کا رابطہ ہے۔ تیرا وجود بے اسکے نہیں اور اسکی نمود بغیر تیرے نہیں۔ قبل ظہور، عالم اس کا عین تھا اور بعد ظہور وہی عین عالم ہے۔ ؂

مشکل حکایتے کہ ہر ذرہ عین اوست
اما نمی تواں کہ اشارت باو کنند

میر کے والد جب انکا کاہی (زردی مائل) رنگ دیکھتے تھے تو گلے لگا کر بنظر شفقت کہتے تھے کہ اے سرمایۂ جاں یہ کیسی آگ ہے جو تیرے دل میں نہاں ہے۔ کیا سوز ہے۔ کہ تیری جاں میں شریک ہوگیا ہے۔ میں ہنس دیتا تھا اور وہ روتے تھے۔ میر صاحب افسوس کرتے ہیں کہ ان کی زندگی میں ان کی قدر نہ بنی۔ میر صاحب کو کھیل کود سے منع کرتے اور خود شناسی کی تعلیم دیتے۔ ان کے والد متصف با وصاف حمیدہ تھے۔ طبیعت مشکل پسند تھی، جان دردمند۔ مژگاں نم۔ حال درہم۔

پھر میر صاحب اپنے والد کی کرامتیں اور خوارق عادات بیان کرتے ہیں۔ یہ بھی اشارہ

کرتے ہیں کہ مرجوع خلایق تھے مگر پروا نہیں کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ دہلی گئے تو صمصام الدولہ امیر
الامرا کو بڑی منت و سماجت کے بعد اذن حضوری دیا۔

میر امان اللہ جنہوں نے میر کو اپنا فرزند بنایا اور جنکی نگرانی میں میر کی تعلیم و تربیت ہوئی
اُن کی حکایت بہت دلچسپ ہے۔

میر صاحب کے والد کا گزر بمقام بیانہ ہوا جو اکبرآباد سے تین منزل کے فاصلے پر ایک شہر
تھا۔ ایک مسجد کے دروازے پر بیٹھ گئے۔ ایک سیدزادہ لالہ رخسار، خوش پرکار (سینہ کشادہ)
اکڑتا ہوا گزرا۔ اُنھوں نے اُس پر نظر ڈالی اور جذبہ کامل سے اپنی طرف کھینچا۔ اُس جوان
خوشرو کی حالت میں تغیر پیدا ہوا اور غش کھاکر گر پڑا۔ بعد ازاں اُن کے قدموں پر سر
رکھدیا۔ اُس کے عزیز سمجھ گئے کہ اُس درویش کی نظر کی تاثیر ہے۔ رحم کے خواستگار ہوئے
اُنھوں نے پانی منگا کے اُس پر دُعا دم کی۔ اور پلا دیا۔ پانی کا حلق سے اُترنا تھا کہ ہوش و حواس
درست ہو گئے اور اُن کے سامنے معتقدانہ دوزانو ادب سے بیٹھکر عرض کی کہ عین بندہ نوازی
ہوگی اگر چندے میرے گھر مہمان ہو جیے گو حضرت اُس عالم میں ہیں جہاں بے نیازی ہے اور ناز پیش
نہیں جاتا۔ فرمایا کہ مضائقہ نہیں مگر مجھے تعجیل ہے اور کل چلا جاؤنگا۔ حاضرین نے عرض
کی کہ ہم آپ کی مرضی کے تابع ہیں۔ زیادہ اصرار سوئے ادب ہے۔ اتفاقاً اُسی رات اُس
لڑکے کی شادی تھی۔ پہر رات گئے براتی اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور استدعا کی کہ آپ بھی
قدم رنجہ فرمائیں تو بزم عروسی کی زینت ہو جائے اور ہمیں سربلندی کا موقع ملے۔ اُنھوں نے
فرمایا کہ مبارک ہو مگر افسوس کہ خدائی خدا پرستی میں سدراہ ہے۔ فقیر کو ایسی
محفلوں سے کیا کام۔ تمہارے ہمراہ جو مشعلیں ہیں اُن سے فتیلے کی بو آتی ہے۔ پھر میر امان اللہ
(نوشاہ) سے مخاطب ہو کے کہا کہ تو کیسا غزال ہے کہ وحشت بھول گیا۔ اگر عقل رکھتا ہے تو یہ
نکتہ سمجھ، "اللہ بس، باقی ہوس" اُدھر وہ لڑکا دلھن کے گھر پہنچا۔ اِدھر درویش نے
شہر چھوڑا اور اطمینان سے اپنے گھر اکبرآباد میں بیٹھ رہا۔ جب اُس جوان کو اطلاع ہوئی
کہ فقیر چلا گیا۔ دلھن کو گھر تو لے آیا مگر اُس سے ملتفت ہونا کیسا پانی تک نہ پیا اور سراسیمہ
و افتاں و خیزاں فقیر کی تلاش میں نکلا۔ کئی دن حیران و سرگرداں رہا۔ ایک دن ایک بزرگ
آئے اور بلطف و نرمی پوچھا کہ کسے ڈھونڈتا ہے۔ علی متقی اکبرآباد میں ہیں۔ امان اللہ نے
اُدھر کی راہ لی شب کا وقت تھا جب شہر میں داخل ہوئے۔ پوچھتے پوچھتے اُن کے گھر پہنچے۔

فقیر کی ایک نظر نے بگڑے کام بنا دئے۔ بہت دلدہی کی، جوان کا سر اپنی آغوش میں لیا اور فرمایا کہ امان اللہ بہت مصیبت اٹھائی۔ عزیزوں کی جدائی کا غم نہ کرو۔ میرا گھر تمہارا گھر ہے اور میرے غلام تمہارے غلام ہیں اور بہت سے نکات معرفت تعلیم کئے۔ میر امان اللہ ریاضت میں مصروف ہو گئے۔ میر کے والد ان کو برادر عزیز کہتے تھے۔ تھوڑی مدت میں فقیر کامل ہو گئے اور ان سے عجائبات ظاہر ہونے لگے۔ ان کے اعزّہ کو خبر ہوئی وہ بھی مشتاق زیارت ہو کر وطن سے آئے۔ مگر ان کی بیوی ق میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ ایک سال اور معتکف رہکر تکمیل ریاضت کی۔

میر صاحب کہتے ہیں کہ میری عمر اس وقت سات برس کی تھی کہ انہوں نے مجھکو اپنے سے مانوس کرنا شروع کیا، اور مجھے اپنا فرزند بنایا۔ ایک لمحہ اپنی نظروں سے جدا نہ کرتے تھے اور بہت لاڈ پیار سے پالا۔ رات دن ان کی خدمت میں رہتا اور ان سے قرآن شریف پڑھتا تھا۔

اسکے بعد میر صاحب نے میر امان اللہ (عم بزرگوار) کی کرامتیں بیان کی ہیں۔ ان کو ایک فقیر احسان اللہ سے بہت عقیدت تھی۔ اور ہفتے میں ایک بار ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے ایک دن انہیں بھی ہمراہ لے گئے۔ پوچھا یہ کس کا لڑکا ہے انہوں نے بتایا کہ علی متقی کا فرزند اور میرا منہ بولا بیٹا ہے۔ فرمایا یہ لڑکا پر پرزے نکالے گا اور ایک ہی پرواز میں آسمان کے پرے[1] ہوگا۔ اس سے کہو کہ درویشوں سے ملتا رہے کہ ان کی ملاقات باعث برکت ہے۔ خشک روٹی کا ایک ٹکڑا پانی میں تر کر کے دیا۔ میر صاحب کہتے ہیں کہ اس لذت کا طعام میں نے ابتک نہیں چکھا تھا اور اس کا ذائقہ فراموش نہیں ہوتا۔

میر صاحب نے اس درویش کی پند و موعظت نقل کی ہے۔ دوسرے درویشوں کی ملاقاتوں کے حالات چھوڑے دیتا ہوں۔ کیونکہ مضمون خلاف توقع طولانی ہوتا جاتا ہے۔ ان کے متعدد اقوال ایسے ہیں جنکو میر صاحب نے نظم کیا ہے۔ مثلاً ایک فقیر نے کہا۔" درویشاں مزاج غیوری دارند۔ برائے دیدن کسے کہ می میرند بسوئے او نمی بینند۔"

میر صاحب کا شعر ہے ؎

نہ ملیں گرچہ ہجر میں مر جائیں عاشقوں کا وصال ہے کچھ اور

یا

سو جس کے لئے اسکو نہ دیکھا نہ سمجھے میر کا کچھ مدعا ہم

[1] مشترک ہے توہو۔

اسی طرح میر کے متعدد اشعار کا ماخذ ان فقیروں کی گفتگو میں ملتا ہے۔ ایک رباعی ایک فقیر کے قول میں درج ہے۔ نہ معلوم کس کی ہے۔ مگر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے ؎

نے دل بخیال زلف ورد باید داد
نے جاں بہوائے رنگ و بو باید داد
ایں جا دل را چہ قدر و جاں را چہ محل
خود را ہمہ او کردہ باو باید داد

آخری مصرع کی تخئیل بے پناہ اور اتھاہ ہے۔

میر صاحب کی عمر مشکل سے گیارہ برس کی ہوگی کہ پہلے میر امان اللہ اور اس کے بعد انکے والد ایک سال کے اندر مرگئے اور ان کی مصیبتوں کا آغاز ہوا۔ حافظ محمد حسن انکے بڑے مگر سوتیلے بھائی تھے انھوں نے ان کی سرپرستی سے انکار کردیا۔

فقیروں کی صحبت اور دعاؤں کا اثر دیکھئے کہ گیارہ برس کا یتیم لڑکا اتنا غیور و خود دار ہے کہ نامہربان بھائی کی منت سماجت نہیں کرتا۔ نہ اپنے باپ یا چچا کے ملنے والوں کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے۔ جب معاش کی تنگی بہت ستاتی ہے تو یکہ و تنہا، بے یار و مددگار وطن چھوڑکر تلاش روزگار میں اکبرآباد سے دہلی روانہ ہوتا ہے اور وہاں پہنچکر بھی۔

"بسیار گردیدم، شفیقے ندیدم"

یہ صورت حال ہے جو ایسے شعر کہلواتی ہے ؎

اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا
مشفق کوئی نہیں ہے، کوئی مہرباں نہیں

یا

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

خدا خدا کرکے امیر الامرا کے دربار میں رسائی ہوتی ہے اور ایک روپیہ روز وظیفہ مقرر ہوجاتا ہے۔ امیر الامرا کا انتقال ہوتا ہے اور یہ اپنے سوتیلے بھائی کے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں غالباً ان کے شہرۂ علم کی بنا پر قیام کرتے ہیں۔ ان کے بھائی کو خبر ہوتی ہے۔ اور وہ خان آرزو کو خط لکھتا ہے کہ میر تقی فتنۂ روزگار ہے۔ زنہار اسکی تربیت میں حصّہ نہ لیجئے

بلکہ دوستی کے پردے میں اس کا خاتمہ کر دیجئے۔ میر صاحب لکھتے ہیں کہ یہ عزیز یعنی خان آرزو واقعی ناداں تھا، میرے ساتھ خصومت شروع کر دی اور ایسی "سلاحی" (قصائی پن) برتی کہ عین دیوانہ ہو گیا میر صاحب کی دیوانگی بھی شاعرانہ تھی، جرم قمر سے ایک ماہ پیکر علیحدہ ہو کر ان کے پاس بصد ناز و کرشمہ آتی تھی صبح ہوتے ایک آہ بھر کر پھر چاند کی طرف مست پرواز ہوتی تھی اور یہ "تمام روز جنوں می کردم"۔ فخر الدین خاں اُن کے کوئی عزیز تھے اُنکو معلوم ہوا، بہت علاج کیا اور خدا خدا کر کے میر صاحب کو صحت ہوئی۔

یہاں بھی میر صاحب کی شرافت نفس، غیرت اور خودداری کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک عزیز قریب اور صاحب اقتدار شخص فخر الدین خاں موجود تھے مگر اُن پر بھی اپنی تنگدستی اور پریشاں حالی کا راز نہ ظاہر ہونے دیا ورنہ ممکن تھا کہ وہ کفیل ہوتے۔ میر صاحب کو تحصیل علم کا بہت شوق تھا۔

وہ واقعات جو میر صاحب کی شاعری کے محرک ہوئے آج کل کے اُن منچلے شاعروں اور اُنکے ہوا خواہوں کو اپیل نہیں کریں گے جنکا خیال ہے کہ حقیقی شاعر ماں کے پیٹ سے شعر کہتا ہوا نکلتا ہے اور اُس کے اشعار جس قدر حیا سوز اور بے تکے، معلق اور مبہم ہوں اُتنا ہی زیادہ بلند مرتبت اور فطری شاعر ہے، نہ اُن انسانوں اور نقال شاعروں اور گم کردہ راہ ادیبوں کو قدر ہو گی جو رنگ زمانہ دیکھکر بدل جاتے ہیں اور لافانی صداقتوں کو پس پشت ڈال کر مزدوروں، کسانوں اور بھکاریوں کے گیت گانے لگتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ موضوعات شاعری کے دائرہ عمل سے خارج ہیں، بلکہ یہ مراد ہے کہ ان شاعروں میں اتنا دم نہیں اتنی صلاحیت نہیں، کہ ان چیزوں کی حقیقت کو اس طرح سنوار کر نمایاں کریں کہ مزدور کے سامنے سرمایہ دار سر جھکا دے، کسان پر زمیندار کو رشک آئے اور بھکاری سے بادشاہ جگہ بدلنے کا متمنی ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ میر صاحب نے امروہے کے ایک سید، سعادت علی کے کہنے سے ریختہ موزوں کرنا شروع کیا اور غالباً اس لئے کہ یہی وسیلۂ معاش بن جائے، مگر ؎

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا — سو ٹھہرا ہے وہی اب فن ہمارا

جہد بلیغ کی اور ایسی مشق بہم پہنچائی کہ مستند مانے گئے اور دہلی بھر میں ڈنکا بج گیا، رؤسا و امرائے جنہیں شوق شعر و سخن تھا اُنکو طلب کرنا شروع کیا، مگر میر صاحب نے اپنی آن بان ہمیشہ قائم رکھی۔ سادات خاں ذوالفقار جنگ انکو بہت مانتے تھے۔ ایک شب ایک قوال کا لڑکا کچھ گا رہا تھا خان موصوف نے کہا کہ اپنے دو تین شعر اسکو یاد کرا دیجئے کہ نے سے گائے۔ اُنہوں نے انکار

کیا اُس کا اصرار بڑھتا گیا۔ میر صاحب فرماتے ہیں "چونکہ اُس کا ملازم تھا ناچار تعمیل کی اور پانچ شعر اُس لڑکے کو یاد کرائے۔ مگر یہ امر میری طبع نازک پر بہت گراں ہوا اور دو تین دن کے بعد خانہ نشین ہو گیا۔ ہر چند بلایا نہ گیا۔ اُس شخص کی مروّت نے گوارا نہ کیا کہ میں بے روزگار ہو جاؤں اور میرے بھائی محمد رضی کو گھوڑا دیا اور نوکر رکھ لیا۔ مدت کے بعد سامنا ہوا تو بہت معذرت کی جس کا جواب میر صاحب نے صرف اتنا دیا کہ "گزشتہ را صلواۃ"!

میر صاحب کی یہ کتاب درانی کے حملۂ لاہور سے لیکر احمد شاہ کی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھرنے اور بہادر شاہ کی آنکھیں نکالنے، دلی کی لوٹ مار اور تباہی اور دیگر عبرتناک واقعات کی مفصل تاریخ ہے ؎

اب خرابہ ہوا جہان آباد ۔۔۔ ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جنکی ۔۔۔ اُنہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنہیں ۔۔۔ تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

یہ زندگی اور یہ حالات تھے جس میں میر اور اُن کی شاعری کا نشو و نما ہوا اور جس نے اُن کی شاعری کو تاثیر کا طلسم بنا دیا۔ اُن کی پرورش اور پرداخت برگزیدہ درویشوں میں ہوئی۔ جن کے قول اور فعل، ظاہر اور باطن میں فرق نہیں تھا۔ جو نیک اور نیکوکار تھے اور جن کی زندگی مکارم اخلاق کا بہترین نمونہ تھی۔ میر صاحب کا عہد عبرت کی ایک کھلی ہوئی کتاب تھا۔ شوق سیاحت اور گردش روزگار اُنہیں مختلف مقامات میں لئے لئے پھرے جس سے مشاہدے میں قوت اور تجربہ میں وسعت پیدا ہوئی تعلیم اور فقرا کی صحبت نے راستی و آزادہ روی کو فطرت ثانیہ بنا دیا، دل قدرتی طور پر دردمند تھا واقعات عبرت انگیز نے اور بھی گداختہ کر دیا۔ پھر سونے میں سہاگا ؎

کچھ رنج دلی میر جوانی میں کھنچا تھا ۔۔۔ زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے اب تک

اب میں میر کی شاعری پر ایک سرسری نظر ڈال کے اس مقالے کو ختم کر دونگا۔

اُردو شاعری پر یہ الزام بڑی حد تک درست ہے کہ اس میں عشق ہوس کاری کا مرادف ہے اور عشق ننگ و نام کو خیرباد کہکر ہر طرح کی ذلت و خواری برداشت کرتا ہے۔ یہ فارسی شاعری کے تتبع کا اثر ہے، بخلاف عربی شاعری کے جس میں عشق ہر چند گوشت و پوست کا مادی و جنسی عشق ہے تاہم خواہشات نفس کی آلودگی سے پاک ہے، چنانچہ قیس و لیلےٰ، وامق و عذرا، کے افسانے مشہور ہیں عاشق و معشوق یکجا ہیں، تنہائی ہے، یہ خوف نہیں کہ کوئی مخل ہوگا مگر کیا مجال جو دست ہوس

دراز ہو ؎

دید کی عشرت، محویت، پھر مدہوشی میخوار کی سی
شوق نے ختم نہیں پہ کیا پُرلطف ملاقاتوں کو (اثر)

مشہور ہے کہ ایک شخص نے ایک مرتبہ ایسی ملاقات کے ہنگام اپنی معشوقہ سے کسی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے فوراً برافروختہ ہو کر جواب دیا کہ وائے ہو تجھ پر کیا تو مجھ سے اپنی ہوس پوری کرنے کو محبت جتاتا تھا؟ وہ شخص فرطِ مسرت سے اچھل پڑا اور اپنی قسمت پر ناز کیا کہ ایسی پاکدامن معشوقہ ملی۔ بعدازاں کہا کہ تجھے آزماتا تھا، دیکھ یہ خنجر ہے اور میں نے جی میں ٹھان لی تھی کہ اگر تیری طرف سے اشارتاً یا کنایتاً بھی رضامندی کا اظہار ہوا تو یہ خنجر تیرے سینے میں پیوست ہوگا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس محبت کا جوہر پاکی و پاکبازی تھا، رشک و بدگمانی کا عنصر تھا بھی تو اپنی ذات یا اپنے عشق سے۔ اردو میں صرف میر وہ واحد شاعر ہے جس نے ایسے معاشقے کے گیت گائے ہیں ؎

داغ ہوں رشکِ محبت سے کہ اتنا بیتاب
کس کی تسکیں کے لئے گھر سے تو باہر نکلا

اسی کی شوریدگیٔ عشق، اسی کا جذبِ محبت ہے جس سے مجبور ہو کر پردہ نشین و صاحبِ عصمت معشوق "اتنا بیتاب" گھر سے باہر نکلا مگر رشکِ محبت سمجھنے نہیں دیتا، غیرتِ عشق یہ خیال بھی گزرنے نہیں دیتی کہ تیرے ہی دل کی دبی چنگاری نے یہ آگ بھڑکائی ہے۔ اس عشق میں دیدہ درای (شاید آپ دیدہ دلیری کو ترجیح دیں) ممنوع ہے، وضعِ احتیاط کے باوصف ڈر لگا رہتا ہے ؎

دونوں طرف سے دیدہ درائی نہیں ہے خوب
اس چاہ کا ہے لطف جو آپس میں ڈر رہے

اس محبت میں بناوٹی ناز نخرے، بے جا غرور و تمکنت بھی ناروا ہیں اور عاشق فوراً ٹوک دیتا ہے ؎

کیا مرے آنے پہ تو او بتِ مغرور گیا
کبھو اس راہ سے گزرا تو تجھے گھور گیا

ایسا عشق مدارات کے ساتھ مساوات کی توقع رکھتا ہے ؎

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم کاہیکو میر کوئی دبے جب بگڑ گئی

گستاخ معشوق کو ظلم و ستم اور جفا کی سزا بھی دیجاتی ہے مگر عجب حسن سے ؎

بعد خونریزی کے مدت بے حنا رنگیں رہا
ہاتھ اُس کا جو مرے لوہو میں گستاخانہ تھا

یا ؎

جم گیا خوں کف قاتل پہ ترا میرزبس
اُن نے رو رو دیا کل، ہاتھ کو دھوتے دھوتے

یہ محبت نہ صرف تواضع بلکہ پُرخلوص برتاؤ کی امید رکھتی ہے ؎

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا   آن بیٹھے جو تمنے پیار کیا

دیگر ؎

چلے ہم اگر تمکو اکراہ ہے   فقیروں کا اللہ اللہ ہے

محبت رگ و پے میں اسقدر جاری و ساری ہے کہ دنیا و مافیہا بھلائے دیتی ہے مگر جذبۂ خودداری کہلواتا ہے کہ ؎

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی، دعا کر میر
کہ اب جو دیکھوں اُسے میں، بہت نہ پیار آئے

ایسے ہی عشق کا ظرف ہے کہ معشوق کو قابو میں لاکر بھی طبیعت پر اسقدر اختیار رہتا ہے ؎

ساعد سیمیں دونوں اُسکے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دئے
بھولے اُسکے قول و قسم پر، ہائے خیال خام کیا

یہی شخص کہہ سکتا ہے کہ ؎

میں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں   پر مجھے یہ بھی خوب جانے ہیں

اظہار محبت کیسا اُس کوچے میں حیا مانع دیدار ہے ؎

مواجس کے لئے اُسکو نہ دیکھا   نہ سمجھے میر کا کچھ مدّعا ہم

کچھ اُدھر تک اُردو شاعری میں نہ صرف رقیبوں کی ریل پیل تھی بلکہ ہمیشہ فتحمند رہتے تھے۔ اور بیچارے عاشق کو ہزیمت نصیب ہوتی ؎

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

مگر میر کہتے ہیں ؎

عشق اُن کو ہے جو یار کو اپنے دمِ رفتن   رخصت
کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

یہی بدگمانی یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے ؎

خط لکھ کے کوئی سادہ نہ اسکو ملول ہو
ہم تو ہوں بدگمان جو قاصد رسول ہو

اردو کا دوسرا نغز گو شاعر فرماتا ہے کہ ؎

مگر لکھوائے کوئی اسکو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے   (غالب)

اردو شاعری نے صرف عاشق کو نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کو ذلیل قرار دیا ہے، بہت بلند پروازی کی تو قبل زوالِ آدم کی کتھا شروع کردی ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں   (غالب)

یا

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے، لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے   (غالب)

میر صاحب نے ہمیشہ انسان کی عظمت دکھائی ہے ؎

آدمِ خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ   آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

؎ ہیں مشتِ خاک، لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

؎ مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

؎ سرکسو سے فرو نہیں آتا   حیف بندے ہوئے، خدا نہ ہوئے

اس سے بھی آگے بڑھتے اور عجب تیج اور بانکپن سے کہتے ہیں ؎

آلہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش   ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے، خدا ہونے

دوسروں سے بندگی کی خواہش رکھنا خود ذلیل ہو جانا ہے، جو دوسروں کی عزت نہیں کرتا وہ اپنی عزت آپ کیا کرے گا۔ کتنا عظیم الشان اور دورِ حاضر کے لئے قابلِ عمل درسِ انسانیت ہے، اسی غزل کا ایک شعر اور سن لیجئے ؎

اب ایسے ہیں کہ صانع کے مزاج اوپر بہم پہنچے
جو خاطر خواہ اپنے ہم ہوئے ہوتے تو کیا ہوتے

اردو شاعری میں Onomatopoeia کا فقدان ہے یعنی آواز یا نشست الفاظ مفہوم کی ترجمانی نہیں کرتی، مغربی شاعری میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں مگر وہاں بھی یہ صنعت صرف حواسِ ظاہری کے مشاہدات کا فرض پورا کرتی ہے مثلاً دریا کی روانی، خنجر کی برشش، وغیرہ، یہ بات نہیں ہے کہ صوت الفاظ کسی جذبے یا قلبی واردات کی پیش خوانی کرے۔ یہ میر کے کمالِ فن کا معجزہ ہے کہ اس نے اردو شاعری میں جس پر سخت قیود عائد ہیں (بحور کے اوزان تلے ہیں، بیت کے دونوں مصرعوں میں ارکان کا برابر ہونا لازمی ہے، بخلاف مغربی شاعری کے جس میں ہر لائن یا مصرع کے ارکان دوسرے مصرع سے کم یا زیادہ ہو سکتے ہیں، خود ارکان میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے، حتیٰ کہ سکتہ بھی جائز ہے) وہ خوبیاں پیدا کر دی ہیں جو مغربی شاعری میں اتنی آزادی پر بھی کمیاب ہیں ؎

کچھ کرو فکر مجھ دِوانے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی

پہلے مصرع سے کس قدر گھبراہٹ ظاہر ہوتی ہے۔ الفاظ اور ان کی ترتیب ایسی ہے کہ آدمی جلد پڑھنے پر مجبور ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اس شخص نے اپنے میں وہ تغیرات محسوس کرنا شروع کر دئے جو ایک مرتبہ پہلے دیوانگی کا پیش خیمہ بن چکے ہیں یعنی خون کا رگوں میں تیزی سے دوڑنا، کان بجنا، دل کا گھبرانا، طبیعت کا بے قابو ہونا۔ اس بیچارے نے مدافعت کی امکانی کوشش کی مگر ناکام رہا، مجبور ہو کر چیخ اٹھتا ہے ع

کچھ کرو فکر مجھ دِوانے کی

دوسرے مصرع میں لفظ دھوم اسطرح واقع ہے کہ گویا ڈھول، تاشے، نقارے اور مختلف فوجی باجے بج رہے ہیں، "بہار" کا لشکر سیل دربیل امڈا چلا آرہا ہے اور اس غریب کا خرمن صبر و ہوش تاراج کئے دیتا ہے۔

معشوق کی نیم باز آنکھوں میں شراب کی مستی پاکر حیرت طاری ہوتی ہے اور منہ سے نکل جاتا ہے ؎

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

مگر اس کے ہونٹوں کی لطافت حیرت کے بجائے اسقدر شوق اور محویت پیدا کرتی ہے کہ جس طرح انکے نظارے سے جی نہیں بھرتا تھا اب ان کا تصور اور بیان خیال کو ہٹنے کی اجازت نہیں دیتا اور لفظ محبت اور اختصار کا گلہ کرتا ہوا نکلتا ہے ؎

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

دونوں شعر ایک ہی زمین کے ہیں مگر دونوں کے پڑھنے میں وقفۂ زمانی میں کس قدر فرق ہے اور یہ فرق ادائے مفہوم میں کس درجہ معین اور انفعالی تاثر کا آئینہ ہے - یہ شعر دیکھئے ؎

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

لفظ سنگ ایسی جگہ واقع ہے کہ ایک پابزنجیر دیوانے نے جو ہاتھ میں پتھر لئے ہے پہلا مصرع پڑھا اور دانت بھینچ کر آنکھیں بند کرکے پتھر سے سر پھوڑ لیا اور خون میں نہا گیا حالانکہ شعر میں ان امور کا ذکر نہیں ہے -

ذیل کے شعر میں نشست الفاظ سے آواز کا اُتار چڑھاؤ اور کم ہوتے ہوتے یکایک زبان کا بند ہوجانا اور آنکھوں کا پھر جانا دکھایا ہے ؎

آنکھوں میں جی مرا ہے ، ادھر دیکھتا نہیں
مرتا ہوں میں تو - ہائے رے صرفہ نگاہ کا

مصرع ثانی کے دونوں ٹکڑوں کا درمیانی وقفہ ناگزیر ہے اور میرے قول کی تصدیق کرتا ہے ؎

یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں اب دو تو جام خالی ہی دو، میں نشے میں ہوں

مطلع کے الفاظ اس طرح واقع ہیں کہ پڑھنے میں شرابی کا لہجہ اختیار کرنا پڑتا ہے ؎

عالم عالم عشق و جنوں ہے، دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں، صحرا صحرا وحشت ہے

اس مطلع کا بہترین تبصرہ صنف نازک کی ایک فرد کا یہ قول ہے کہ اگر آدھی رات کے سناٹے میں پڑھو تو آدمی ڈر جائے ! ملحوظ خاطر رہے کہ جتنی مثالیں پیش کی گئیں اُن میں وہ الفاظ نہیں آئے ہیں جو بربنائے صوت وضع ہوئے ہیں اور اسطرح اُن میں بالذات خیال کی صوری ترجمانی کی صنعت موجود ہے - ایسے الفاظ کی اُردو میں کمی نہیں - اُن میں وہ خلوئے مطلب ہے جو سیاق عبارت سے خود بخود پورا

ہو جائے۔ بلکہ ایک بالکل نئی چیز ہے جو الفاظ و معنے کے بے مثل توازن کا نتیجہ ہے۔

میر صاحب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک گوشہ نشین شاعر تھے جنہوں نے مناظر فطرت کا مطالعہ نہیں کیا اور اسکی مصوری اُنکے کلام میں نہیں ہے، یہ دونوں الزام غلط اور بے بنیاد ہیں، میر غریب نے نہ معلوم کہاں کہاں خاک اُڑائی ہے، یہ واقعہ ہے جس کا حوالہ تذکروں میں نیز جابجا اُن کے کلام میں موجود ہے۔ البتہ اُن لوگوں کی سادہ لوحی اور کور سوادی قابل عبرت ہے جو درخت کو درخت، پہاڑ کو پہاڑ اور دریا کو دریا کہدینا شاعری کی معراج سمجھتے ہیں۔ میر نے سب کچھ کہا مگر شاعرانہ انداز میں۔

دامن کوہ سے بخارات اُٹھے، جھالا برسا اور مطلع صاف! ؎

دامانِ کوہ میں جو میں ڈاڑھ مار رویا
اک ابر واں سے اُٹھ کر بے اختیار رویا

ڈھاک کا جنگل پھولا ہوا میں نے بھی دیکھا تھا مگر پھولوں کی ساخت پر کبھی غور نہیں کیا تھا صرف رنگ سے لطف اُٹھایا تھا۔ شاید اور حضرات کا بھی یہی تجربہ ہو مگر میر عزلت گزیں نے ان کی مشابہت شیر کے خوں آلود ناخن سے دریافت کی اور یہ بات قریب سے گہرے مطالعہ کے بغیر ناممکن تھی ؎

آلودہ خوں سے ناخن ہیں شیر کے سے ہر سو
جنگل میں چل، بنے تو، پھولا ہے زور ڈھاک

میر صاحب نے سرسوں بھی پھولی دیکھی تھی اور دل میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی ؎

سحر سواد میں چل، زور پھولی ہے سرسوں
ہوا ہے عشق ہی کل زرد، کیا بہار ہے آج

موسم کے تغیرات کے ساتھ ساتھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب کا مرکز طلوع بدل گیا، میر صاحب نے اسے "مشرق نو" سے تعبیر کیا ہے ؎

پیدا ہے روز مشرق نو کی نمود سے
نکلے ہے کوئے یار سے بچ بچ کر آفتاب

اس طرح میں فارسی اساتذہ کے قصائد ہیں، میر صاحب نے غزل کہی اور حق یہ ہے کہ خوب کہی، اُنہوں نے حافظ۔ طالب آملی۔ صائب اور دوسرے فارسی شاعروں کی غزلوں پر کامیاب غزلیں کہی ہیں۔ کبھی موقع ہوا تو موازنہ کر دیا جائیگا۔

موسم بہار میں طائران آزاد خوش اور مست پر پھلائے ہوئے، ہری ہری شاخوں پر چہچہاتے اور پھدکتے پھرتے ہیں۔ میر صاحب نے دیکھا اور نظم کیا ؎

قفس کے چاک سے دیکھوں ہوں میں تو تنگ آتا ہوں
چمن میں غنچہ ہو آنا گلوں پر ہمصفیروں کا

نہ ہو کر

کیا جس نے صبح کے نظارے سے لطف نہ اٹھایا ہو اور آفتاب کی تابندگی کے مختلف مدارج نہ دیکھے ہوں یہ مطلع کہہ سکتا ہے؟ ؎

لطف اگر یہ ہے بتان صندل پیشانی کا
حسن کیا صبح کے پھر چہرہ نورانی کا

مطلع میں استعارے کا حسن تعریف سے مستغنی ہے، ادھر بتوں کی پیشانی ہے ادھر بیاض صبح، ادھر صندل پیشانی ہے، اُدھر آفتاب کی کرنیں، ان کا رنگ اُڑ کر سپید ہو گیا۔ ان کی کندن سی دمک بڑھتی ہی جاتی ہے!

مشین ایجاد ہونے سے پہلے شیشے کے ظروف منہ سے نالی کے ذریعہ ہوا بھر کے ڈھالے جاتے تھے، میر صاحب نے یہ تماشا دیکھا تھا ؎

بات احتیاط سے کر، ضائع نہ کر نفس کو
بالیدگی دل ہے مانند شیشہ، دم سے

یا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

میر صاحب اور جوگی ؎

کبتلک دھونی رمائے جوگیوں کی سی رہوں
بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے تو میرا آسن جلا

سیلاب سے ایک ہوش پیترے کرنے والی صدا پیدا ہوتی ہے۔ میر صاحب غالباً دوچار ہو چکے تھے ؎

سنا ہے میں جان کے ہوش و حواس و دم نہ تھا
اسباب سارا لے گیا، آیا تھا اک سیلاب سا

"سنا ہٹنے" سے بہتر کوئی لفظ سیلاب کی آواز بیان نہیں کرسکتا۔

کیا برسات کا نقشہ اس سے بہتر کسی نے کھینچا ہے ؎

چلتے ہو تو چمن کو چلئے، کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں، کم کم بادو باراں ہے

"کم کم بادو باراں" نے نزاکت، لطافت اور صناعی کی آخری حدیں قائم کردیں۔ موسیقیت کا یہ عالم ہے کہ پڑھئے اور جھومئے، جھومئے اور پڑھئے۔

میر صاحب نے دیکھا تھا کہ گلاب کی پنکھڑیوں کی شیرازہ بندی چند ہری پتیوں سے ہوتی ہے، یہ پتیاں پنجۂ بلبل سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔ اب چمن چمن نہیں رہا بلکہ عرصہ حشر ہے جس میں بلبل (عاشق) گل (معشوق) کا دامن پکڑے ہوئے مظالم و تغافل کی داد خواہ ہے! ؎

"اگتے تھے دست بلبل و دامان گل بہم
صحن چمن نمونۂ یوم الحساب تھا"

ایک شعر جو نہایت معتبر ذریعے سے معلوم ہوا کہ میر صاحب کا ہے گو اُن کے مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں عہد پاستاں کے جابر بادشاہوں کی زندہ تاریخ ہے، جب کسی شہر یا قریہ کے باشندوں پر عتاب شاہی نازل ہوتا تھا تو آبادی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی تھی اور کسی بلند تودے پر رات کو چراغ جلا دیا جاتا تھا تاکہ تاریکی میں بھی رہرو عبرت حاصل کرے اور شاہی قہر کا نمونہ پیش نظر رہے ؎

روشن ہے اس طرح دل سوزاں میں داغ ایک
اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

میر انیس نے جو وقت یہ مطلع ایک نواب صاحب سے سنا تو دیر تک اضطراب کی حالت رہی، ٹہلتے تھے اور بار بار پڑھتے تھے آخرکار نواب صاحب سے کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں مرثیہ گوئی ترک کرکے غزل کہنا شروع نہ کردوں تو میرے سامنے ایسے شعر نہ پڑھا کیجئے۔

اگر شاعری فطرت کی نقالی نہیں بلکہ ترجمانی ہے تو آج کل کے بہت سے فطرت نگار شاعر برخود غلط ثابت ہوتے ہیں اور سہرا میر کے سر رہتا ہے۔

میر کی شاعری میں صناعت اُس درجۂ کمال پر ہے کہ الفاظ کی سادگی، سلاست اور موسیقی معنوی خوبیوں اور گہرائیوں کو اپنی آڑ میں لے لیتی ہے، ایک معشوق ہے جس کی روح بھی اُسکے

جسم کی طرح حسین ہے۔ مگر روح کے حسن تک رسائی آسان نہیں، صورت پرست معنی آشنا نہیں ہوتے اس کے لئے گہرے مطالعہ اور قلبی موانست کی ضرورت ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

دل عجب شہر تھا خیالوں کا لوٹا مارا ہے حسن والوں کا

شعر میں بظاہر کچھ نہیں مگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس دل کا ہر خیال ایک شاہد طناز تھا، اسقدر حسین کہ معشوقوں کے دلوں کو موہ لیا، ٹوٹ پڑے اور لوٹ گئے، میر نے عشق میں حسن پیدا کیا اور حسن کو عشق کا عاشق بنا دیا مگر پھر بھی حسن کی شان معشوقی بحال رکھی کہ رعنائی دل کی پذیرائی قتل و غارت سے ہوئی ؎

اُن نے کھینچا ہے مرے ہاتھ سے داماں اپنا
کیا کروں، گر نہ کروں چاک گریباں اپنا

کتنا سادہ مگر بلیغ مطلع ہے! بظاہر تخیل صرف اتنی ہے کہ عاشق زار نے دردِ دل کہنے کو معشوق کا دامن تھاما مگر اس بے مہر نے ہاتھ سے دامن کھینچ لیا، عاشق اسقدر متاثر ہوا کہ اپنا گریبان پھاڑ ڈالا بادی النظر میں تصنع اور مبالغے کے سوا کچھ نہیں، مگر تخیل و محاکات اس طرح دست و گریبان ہیں، کہ معنوی لطافتوں کی انتہا نہیں رہی، ایک شخص ہے کہ دستِ تاسف مل رہا ہے، خاک پر لوٹ رہا ہے اور بار بار کہتا ہے ع اُن نے کھینچا ہے مرے ہاتھ سے داماں اپنا

شعر کی تاثیر دراصل لفظ "اُن نے" میں مضمر ہے، حالانکہ یہ لفظ متروک ہے اور اس کی جگہ "اس نے" بآسانی پڑھ سکتے ہیں، پڑھیے اور دیکھیے کہ شعر میں کچھ نہیں رہ جاتا۔ یہ میر کی فصاحت کا محیر العقول کرشمہ ہے۔ بات یہ ہے کہ "اُن نے" سے اس شخص کے کردار پر روشنی پڑتی ہے جس کی نمایاں خصوصیتیں، سادگی، معصومیت اور بھولاپن ہیں، محض نشست الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ معشوق کا دامن تھامنے سے اس کا مدعا ایسا نہ تھا جس پر ارباب عشق دوفا ملامت یا خوردہ گیری کر سکیں عشق کرتے ہوئے مدت گذر چکی تھی۔ امتیاز و اعتبار پیدا کیا تھا اور یقین تھا کہ اب معشوق کو میری طرف سے بدگمانی نہ ہوگی۔ میرے عشق کے خلوص اور پاکی میں شک نہ رہا ہوگا۔ مگر آہ پھر بھی اُن نے ہاتھ سے دامن کھینچ لیا۔ اب سوا اسکے کوئی چارہ نہیں کہ اپنا گریباں چاک کرے۔ دامن کھینچنے میں جو معشوق کے ہاتھ کو جنبش ہوئی اس سے گریباں چاک کرنے کا اشارہ شاعری کی وہ منزلیں ہیں جہاں شاذ و نادر ہی گزر ہوتا ہے۔ یہ کمال صرف میر کو حاصل ہے۔ اسی ربط نے تخیل کو آسمان پر پہنچا دیا اور راز و نیاز حسن و عشق کا وہ منظر پیش کیا جسکی نظیر ملنا مشکل ہے۔ معشوق کا دامن کھینچنا

اشارہ تھا اس امر کا کہ اب تیرا عشق اس درجے پر پہنچ گیا ہے کہ تجھے نہ صرف مجھ سے بلکہ اپنی ذات سے بھی بیگانہ ہو جانا چاہیئے۔ اصطلاح عشق میں دیوانگی و گریباں چاکی اسی بیخودی یا ترک خودی کا دوسرا نام ہے۔

میر کی شاعری میں اتنی خوبیاں اور اسقدر تنوع ہے کہ انکا احصا قریب ناممکن ہے۔ میر نے بہت کچھ لکھا اور بار بار لکھا مگر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بھی نہیں لکھا۔ زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جس کی مصوری میر نے بہترین الفاظ اور موثر پیرایہ میں نہ کی ہو۔ مذہب، حکمت، فلسفہ، تصوف، سائنس، مابعد الطبیعیات، اخلاقیات، کوئی موضوع اُن کی شاعری کی دسترس سے باہر نہیں ہے۔ مذہب کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ یہ براہ راست عبد اور معبود میں واسطہ ہے سماج کے معاملات میں اسکو دخل نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ مذہب پر گفتگو تضیع اوقات ہے ؎

مذہب سے میرے کیا تجھے میرا دیار اور
میں اور، یار اور، مرا کاروبار اور

اُن کا نظریہ یہ ہے کہ جو جس مذہب پر ہو خواہ لامذہب ہی کیوں نہ ہو۔ اسکو اُس کے حال پر چھوڑ دو ؎

راہ سب کو ہے خدا سے جان اگر پہنچا ہے تو
راستے ہوں مختلف کتنے ہی، منزل ایک ہے

اسی مفہوم کو ایک دوسرے نادر اسلوب سے ادا کیا ہے ؎

چاہے جس شکل سے تمثال صفت اُس میں در آ
عالم آئینے کے مانند در باز ہے ایک

مگر یہ اختلاف ہے کیوں؟ یہ نیرنگ حسن دوست کا کرشمہ ہے ؎

ہم نہ کہتے تھے کہیں زلف کہیں رخ نہ دکھا
اختلاف آیا نہ ہندو و مسلماں کے بیچ

مصیبت یہ ہے کہ اس اختلاف نے فساد کی صورت اختیار کر لی ہے ؎

مسلم و کافر کے جھگڑے میں جنگ و جدل سے رہائی نہیں
دونوں پہ لو تیغیں گرتی رہینگی کٹتے رہینگے سر کے سر

(چونکہ تلوار کی جگہ لاٹھی نے لے لی ہے کٹتے رہینگے کے بجائے پھٹتے رہینگے سر کے سر پڑھیے)

مسائل حکمیہ تو میر صاحب نے وہ وہ بیان کئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ چند مثالیں کافی ہونگی:-

یہ دو ہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم
یا عالم آئینہ ہے اُس یار خود نما کا

قصر و مکان و منزل، ایکوں کو سب جگہ ہے
ایکوں کو جا نہیں ہے، دنیا عجب جگہ ہے

علم الارض ایک جدید علم ہے جس نے کرۂ ارض کو بہت قدیم ثابت کیا ہے۔ ورنہ اسکی مدت چند ہزار برس سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی تھی، مگر میر صاحب ڈیڑھ سو برس اُدھر کہتے ہیں:-

ہم جانتے تھے تازہ بنا ہے جہاں کو لیک
یہ منزل خراب ہوئی ہے کبھو کی طرح

مادئین کو دنداں شکن جواب دیتے ہیں:-

آیاتِ حق ہیں سارے یہ ذراتِ کائنات
انکار تجھکو ہووے تو اقرار کیوں نہ ہو

ذروں کو ماننا مگر اُنکو نشانیاں نہ جاننا ہوشمندی نہیں۔

یہاں کی ہر شی اشارہ کرتی ہے کہ اس کے ظاہر کا ایک باطن بھی ہے:-

آئینہ ہو کے صورتِ معنی سے ہے لبا لب
رازِ نہانِ حق ہیں کیا خود نمائیاں ہیں

وجود خارجی معتبر نہیں:-

مشہور ہیں عالم میں تو کیا، ہیں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

اشکال عالم ہستیٔ مطلق کے مظاہر ہیں، بالذات کچھ نہیں:-

ہستی ہے اپنے طور پہ جوں بحر جوش میں
گرداب کیا، موج کہاں ہے، حباب کیا

یہی بات غالب بھی کہتے ہیں:-

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر

یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

مگر میر کے شعر کی جامعیت کہاں جس میں بحر محض بطور تمثیل استعمال ہوا ہے اور اصل بحث ہستی مطلق سے ہے۔ غالب کے شعر میں وہ جوش و حرکت بھی نہیں جو میر کے شعر میں ہے نہ صورتگری کی وجہ بیان کی۔ میر کے شعر میں موجود ہے یعنی جوش جو لازمہ ہستی ہے۔ اسی سلسلے میں آتش کا ایک شعر بھی سن رکھنے کے قابل ہے ؎

اثر رکھتی ہے گلگوں کی کیفیت کا ہستی ہے

ابھرنے میں حباب بحر کے اک جوش مستی ہے

میر صاحب اردو کے پہلے شاعر ہیں جو تسلسل حیات کے قائل ہیں اور مرگ کو ایک وقفۂ سکون سے زیادہ وقعت نہیں دیتے جس طرح تھکا ماندہ مسافر تھوڑی دیر دم لے کے پھر منزل کی طرف روانہ ہوتا ہے ؎

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے

یعنی آگے چلیں گے، دم لے کر

میرے ایک محترم دوست نے ایک مضمون میں تحریر فرمایا ہے کہ میر محض محبت کے مانگتے ہیں، ان کی شاعری میں فلسفۂ حیات معدوم ہے۔ یہ خیال نظیر اکبرآبادی کی غزل گوئی کے سلسلے میں ظاہر کیا تھا۔ لہذا گمان ہوتا ہے کہ وہ میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کے بیان کو زندگی کی تفسیر و تشریح سمجھتے ہیں۔ اگر در اصل ایسا ہے تو نظیر کو میر پر یقیناً فوقیت ہے گو یہ دائرہ غزل کا نہیں بلکہ نظم کا ہے اور مضمون کا عنوان جیسا عرض کیا گیا "نظیر کی غزلگوئی" ہے۔ لیکن اگر حیات ان سطحی امور سے بالاتر کوئی چیز ہے اور مقصد حیات روح کو آزاد و "بیزدان شناس" بنانا اور اس عظیم و نامحدود طاقت کو اپنی ذات میں براگندہ نقاب کرنا ہے جسکو ناواقف اپنے سے باہر ڈھونڈتے ہیں، جس کے مختلف و متعدد نام ہیں اور پھر کوئی نام نہیں، اگر حیات نام ہے تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب سے مادی خواہشات پر فتح پانے اور رموز و حقایق کی عقدہ کشائی کا تو مجھے اس امر کے اعلان میں کوئی باک نہیں کہ میر کے مقابلے میں نظیر طفل مکتب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور اسکو میر کے مقابلے میں وہ بھی غزل کے میدان میں پیش کرنا بڑی زبردستی ہے۔ میں نے اکثر معتقد راویوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ میر کے یہاں تصوف ہے مگر اس پایہ کا

اور اُس کثرت سے نہیں جتنا خواجہ درد کے کلام میں ہے، اس عقیدے کا سنگ بنیاد شاید اس حسن ظن پر رکھا گیا ہے کہ چونکہ خواجہ درد صاحب سجادہ صوفی تھے لہذا وہ رموز و مسائل تصوف سے زیادہ آگاہ تھے اور متصوفانہ اشعار کہنے میں بھی میر سے بڑھے چڑھے تھے۔ خواجہ صاحب کا تقدس ان کی برگزیدگی مسلم، ان کی شاعری میں تصوف کی چاشنی ہونا ایک ناقابل انکار حقیقت، مگر یہ نہ بھولنا چاہیے کہ میر کے والد بھی ایک بڑے خدارسیدہ درویش تھے۔ میر امان اللہ ان کے مرید خاص جن کی آغوش میں میر نے تربیت پائی کامل فقیر تھے۔ میر کی کتاب "ذکر میر" پڑھیے تو آنکھیں کھل جائیں کہ انہیں تصوف کے کیسے کیسے نکات معلوم تھے اور کس قدر دستگاہ تھی یہ کہہ دینا کہ میر نے اتنے پایہ کے متصوفانہ اشعار نہیں کہے جتنے خواجہ درد نے کہے ایسا دعویٰ ہے جو ثبوت کا محتاج ہے۔ کیا اچھا ہو کہ کوئی صاحب اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے میر اور درد کا موازنہ کریں تاکہ منصفانہ رائے قائم ہو سکے۔ فی الحال میر کے چند متصوفانہ اشعار بغیر کسی تبصرے کے درج کئے دیتا ہوں۔ یہ محض نمونہ ہے کوئی صاحب یہ نہ فرض کریں کہ یہی چوٹی کے شعر ہیں، صرف دیوان اول کی ایک ردیف (نون) سے چن لئے گئے ہیں ؎

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں — اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں
عجز و نیاز اپنا، اپنی طرف ہے سارا — اس مشت خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں
صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وہ معنی — اہل نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں
عشق ان کی عقل کو ہے جو ماسوا ہمارے — ناچیز جانتے ہیں، نابود جانتے ہیں
اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے — اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں
مر کر بھی ہاتھ آوے تو میر مفت ہے وہ — جی کے زیان کو بھی ہم سود جانتے ہیں

شیخ اگر کعبے میں آ کر گفتگو درہم کروں — ہوں سیہ مست سر زلف صنم، معذور رکھ

آئینہ ہو کے صورت معنی سے ہے لباب — راز نہاں حق میں کیا خودنمائیاں ہیں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر — میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں

سر تلک آب تیغ میں ہوں غرق   اب تئیں آب آب کرتا ہوں

اگرچہ نشہ ہوں سب ہیں خُم جہاں میں لیک   برنگِ مَے عرق انفعال اپنا ہوں
مری نمود نے مجھکو کیا برابر خاک   میں نقش پا کی طرح پائمال اپنا ہوں

کیفیتیں اُٹھی ہیں یہ کب خانقاہ میں   بدنام کر رکھا ہے خرابات کے تئیں

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

غالبؔ

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

ذوقؔ

اُردو زبان ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آبا و اجداد سے ایک مشترکہ ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعًا ناقابلِ تقسیم ہے۔

سر تیج بہادر سپرو

کلامِ اقبال

اعتراضات:-

(۱) "ایرانی شاعری میں تصوف کے ساتھ ساتھ رچی ہوئی مہذب بے نیاز پرستی ضرور موجود ہے۔ اور اقبال کو یہی عجمیت بری لگتی ہے۔ کیونکہ اقبال صوفی ہوتے ہوئے بھی کائنات کو نہ اپنا گھر سمجھ سکے اور نہ کائنات سے ہم آہنگ ہو سکے۔ خودی کے فلسفہ نے ان کے اندر کائنات کے لئے توہین کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دئے ہیں۔"

(۲) اقبال کی شاعری میں "ہم" پر بہت زور دیا گیا ہے۔ خواہ یہ "ہم" اسکے ہموطنوں کے لئے ہو خواہ ہم مذہبوں کیلئے اسمیں جارحانہ عنصر ضرور موجود ہے۔ اسکی دعوتِ عمل خواہ ایک خاص جغرافیائی حدود میں رہنے والوں کے لئے ہو اور خواہ ایک خاص مذہب کے پیروؤں کے لئے۔ ایسے جذبات کی محرک ہوسکتی ہے جو انسانی روح میں رحم اور کشادہ حوصلگی کے جذبات کو پس پشت ڈالدیں۔

(۳) اقبال کی شاعری میں موسیقی اور مناظر فطرت کی عکاسی محض سرسری ہے۔

محاکمہ

میاں بشیر احمد صاحب
ایڈیٹر "ہمایوں" لاہور

اقبال نے سچ کہا ہے ؎

بے تاب ہے اس جہاں کی ہر شے کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے

چند روز ہوئے سہ پہر کے وقت میں اپنے کمرے میں آرام کر رہا تھا کہ مجھے ایس۔ پی کالج سرینگر کے پروفیسر احسان الحق صاحب کا ملاقاتی کارڈ ملا۔ ملنے پر معلوم ہوا کہ یہ میرے نام اپنے پرنسپل اور میرے دوست تاثیر صاحب کا ایک حکمنامہ لے کر آئے ہیں۔ اور وہ یہ تھا کہ علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کے متعلق تین سوالات بلکہ اعتراضات کا جواب لکھ دو۔

میں غریب الوطن ہٹلر اور جاپانیوں اور لاہور کی گرمی کے ظلم وستم سے بھاگ کر کشمیر کی وادی میں پناہ لینے آیا لیکن یہاں آتے ہی لینے کے دینے پڑ گئے۔ دوستوں نے بھی لحاظ نہ کیا۔ تاثیر صاحب کو اتنا

خیال نہ آیا کہ دوست ہے کالج کا طالب علم نہیں کہ لگوں بے دھڑک اس کا امتحان لینے ۔ میں نے
ان کے پیغام بر سے بہتیری منت و سماجت کی لیکن اُنھوں نے اُردو کا واسطہ دے کر جو اصرار
کیا تو انکار بن نہ آیا ۔ کشمیر فضائے شاعری اقبال اُردو ان سب کا ایک گہرا تعلق ہے یا ہونا چاہیئے
میرا جذبۂ بے اختیار شوق و جوش میں آگیا، میں نے دو چار سطریں لکھنے کی حامی بھرلی۔ بوجوہ
میرے جوابات مختصر ہونگے ۔

پہلا اعتراض یہ ہے کہ اقبال کائنات سے ہم آہنگ نہیں اور اُس کی توہین کرتا ہے ۔
مطلب یہ ہے کہ وہ چیزوں کو بہتر بنانے کا خواہشمند کیوں ہے ؟ چیزیں ہیں ہی بہترین اقبال
اُن کو کیا بہتر بنائے گا ۔ گویا حافظ نے بھی کائنات کی توہین کی جب کہا کہ :-

فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

اقبال کا پیغام ہے بڑھو اور بڑھاؤ ۔ ترقی یافتہ انسان خدا کا ہاتھ ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ   غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات   ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دلِ بے نیاز

خدا کی خدائی میں کائنات بہتر سے بہتر ہوتی جاتی ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید   کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں

اس لئے صرف ترقی کرنے والا انسان ہی کائنات سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے اور کائنات کی توہین
کرتا ہے تو وہ شخص جو محض کھڑا یا پڑا رہے اور سبحان اللہ اور واہ وا کہتا رہے ۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اقبال تنگ نظر ہے اور صرف ایک خاص ملت کو دعوتِ عمل دینے والا
شاید مطلب یہ ہے کہ موجودہ اشتراکیت کی ہمہ گیری اقبال کے قومی نصب العین سے بہتر ہے یعنی
پہلے یہ اعتراض تھا کہ اقبال بے دین ہے اب یہ اعتراض ہے کہ وہ دین دار ہے ۔ اقبال فی الحقیقت
ان دونوں سے بالاتر ہے ؎

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا   یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی!

ملک و ملت پیچھے رہ جاتے ہیں ۔ دُنیا بھی پیچھے رہ جاتی ہے ۔ اقبال مادیت کا قائل نہیں وہ روحانیت
کا علمبردار ہے اُس کی تلوار ہمہ گیر محبت ہے ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم   جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

زمیں کیا اُس کے لئے آسمان کی حد بھی درست نہیں ؎

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

وہ بلند نظر اور فعّال زندگی کا قائل ہے جو فکر و فلسفہ سے بلند تر ہے ؎

ضمیر پاک و نگاہ بلند و مستیٔ شوق — نہ مال و دولت قاروں نہ فکر افلاطوں

یہ غلط ہے کہ اس کی نظر صرف کسی ایک ملک یا ملت تک محدود ہے ؎

تو ابھی رہ گزر میں ہے قید مقام سے گزر — مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر

اور اگر وہ کسی خاص ملت سے وابستہ ہے تو اُس ملت کو عالمگیر بنا نا چاہتا ہے مشرق و مغرب کو ملت واحدہ بنا دینا چاہتا ہے۔ یہ بڑا کام ہے اس کے لئے مسلسل جد و جہد کی ضرورت ہے ؎

کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشادِ شرق و غرب — تیغِ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر

اس جد و جہد میں عالمگیر محبت کے عنصر کا وجود لازم ہے ؎

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی — نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں موسیقی اور دلنوازی نہیں۔ کسی شاعر کے تمام اشعار میں موسیقی بدرجۂ اتم نہیں پائی جاتی۔ سوال یہ ہے کہ کیا اقبال کے کلام میں موسیقیت کی بہترین مثالیں موجود ہیں؟ یقیناً! کہا گیا ہے کہ "بانگ درا" میں موسیقی ہے۔ لیکن بعد کے اردو کلام میں محض خشک فلسفہ ہے، اس خشک فلسفے کی تری کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

اگرکج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا؟ — مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا؟

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی — خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

اور اس سے زیادہ دل خوش کن موسیقیت کہاں سے ملے گی؟

عالم آب و خاک و باد! سرِ عیاں ہے تو کہ میں — وہ جو نظر سے ہے نہاں اُس کا جہاں ہے تو کہ میں؟

وہ شبِ درد و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے — اُس کی سحر ہے تو کہ میں اُس کی اذاں ہے تو کہ میں؟

کس کی نمود کے لئے شام و سحر ہیں گرم سیر — شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تو کہ میں؟

تو کفِ خاک و بے بصر! میں کفِ خاک و خود نگر! — کشتِ وجود کے لئے آبِ رواں ہے تو کہ میں؟

مناظر فطرت کے سلسلے میں "ایک آرزو" اردو کی بہترین نظموں میں شمار ہو سکتی ہے۔ فلسفے کے دور میں بھی یہ تصویر کشی مفقود نہیں ہوگئی۔

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن — مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار — اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

برگِ گل پہ رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح — اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حسن بے پرواکو اپنی بے نقابی کے لئے — ہوں اگر شہروں سے بن پیارے توشہر اچھے کہ بن؟

دیکھئے موسیقی اور فلسفہ کس طرح دو قالب یک جان ہوگئے ہیں ؎

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ — یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ!
یا سنجر و طغرل کا آئینِ جہانگیری — یا مردِ قلندر کے اندازِ ملوکانہ
یا حیرتِ فارابی یا تاب و تبِ رومی — یا فکرِ حکیمانہ یا جذبِ کلیمانہ
یا عقل کی روباہی یا عشقِ یداللٰہی — یا حیلۂ افرنگی یا حملۂ ترکانہ
یا شرعِ مسلمانی یا دیر کی دربانی — یا نعرۂ مستانہ کعبہ ہو کہ بت خانہ!
میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں — کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ!

جبریل کے مقابل میں ابلیس کا نعرہ نعرہ نہیں نغمہ ہے :-

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا — میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو!
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح — تو فقط اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو!

اور فارسی کلام تو بیشتر موسیقی اور دلنوازی سے ہم آہنگ ہے ستاروں کا گیت مشہور ہے ؎

ہستیٔ ما نظامِ ما — مستیٔ ما خرامِ ما — گردشِ بے مقامِ ما — زندگیٔ دوامِ ما
دورِ فلک بکامِ ما — می نگریم و می رویم

گرمیٔ کارزارہا — خامیٔ پختہ کارہا — تاج و سریر و دارہا — خواریٔ شہریارہا
بازیٔ روزگارہا — می نگریم و می رویم

خواجہ زسروری گذشت — بندہ زچاکری گذشت — زاری و قیصری گذشت — دورِ سکندری گذشت
شیوۂ بت گری گذشت — می نگریم و می رویم

پیشِ تو نزدِ ما کمے — سالِ تو نزدِ ما دمے — اے بکنارِ تو یمے — ساختۂ بہ شبنمے
ما بہ تلاشِ عالمے — می نگریم و می رویم

فصلِ بہار کی آمد دیکھئے :-

خیز کہ در کوہ و دشت — خیمہ زد ابرِ بہار
مستِ ترنم ہزار — طوطی و دراج و سار — برطرفِ جوئبار — کشتِ گل و لالہ زار
چشم تماشا بیار

خیزکہ در کوہ و دشت   خیمہ زد ابر بہار

خیزکہ در باغ و راغ   قافلۂ گل رسید

بادِ بہاراں وزید   مرغ نو آفرید   لالہ گریباں درید   حسنِ گل تازہ چید

عشق غمِ نو خرید

خیزکہ در باغ و راغ   قافلۂ گل رسید

کشمیر جنت نظیر کی تصویر یوں کھینچتے ہیں ؎

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر   سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر

بادِ بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج   صلصل و سار زوج زوج بر سرِ نارون نگر

الفاظ و معانی کا یہ ربط صرف ایک حقیقی شاعر کے ہاں نظر آتا ہے ۔

سنوار باغ سرینگر کشمیر ۔ ۲۲ مئی ۱۹۴۲ء   بشیر احمد

ڈاکٹر تاثیر

(۱) ۔ اقبال کی اسلامیت نے اسکی شاعری کو محدود کر دیا ہے؟ ۔

یہ سوال پہلو دار ہے اور درحقیقت کئی سوالوں سے مرکب ہے ۔

وہ لوگ جو ادب برائے ادب کے بہت سختی سے پیرو کار ہیں ان کے نزدیک "اسلامیت" محض نظریۂ حیات ہونے کی وجہ سے غیر شاعرانہ ہے ۔ وہ اقبال کی شاعری کو محدود نہیں بلکہ مفقود سمجھتے ہیں ۔ ان کے نزدیک ہر منظم خیال ہر پیغام ، ہر دعوتِ عمل مردود ہے ۔ یہی نہیں بلکہ وہ موضوع سخن کو غیر متعلق اور طرزِ سخن کو اصل شاعری قرار دیتے ہیں ۔ ان کے خیال میں چرکین اور میر انیس کی شاعری ہم پایہ ہے ۔ یہ لوگ شاعری کو فن شاعری تک محدود سمجھتے ہیں ۔ ان کا یہ اختلاف شاعری کے لفظ کی تعریف پر مبنی ہے ۔ اگر شاعری سے مراد محض اصواتِ الفاظ ہے تو پھر ان کے مطابق فقط بے معنی الفاظ کا مجموعہ ہی بہتر شاعری ہے اور جہاں معانی کو شاعری میں شامل کیا گیا تو معانی کے ساتھ مضمون اور موضوعِ سخن کو بھی اہمیت حاصل ہوگئی ۔ اور جب یہ ہوا تو پھر "اسلامیت" بذاتِ خود غیر شاعرانہ نہ رہی ۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو محض جذبات ہی کو شاعری کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک فکر و خیال شاعری کے منافی ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ خاص نظام خیال و فکر سے بھی جذبات وابستہ ہوسکتے ہیں۔ در اصل یہ لوگ پرانے علم النفسیات سے گمراہ ہو کر خیالات اور جذبات کو دو متضاد ذہنی حالات تصور کرتے ہیں۔

بعض ادب برائے زندگی کے حامی اسلامیت کو ایک "غلط" نظریۂ حیات سمجھ کر اقبال کی شاعری کو رجعتی قرار دیتے ہیں۔ یہ غیر شاعرانہ معیار ہے۔ بعض ہندوستانی قومیت کے حامی "اسلامیت" کو ایک مخصوص نظریہ سمجھ کر اقبال کی شاعری کو محدود گردانتے ہیں۔ یہ معیار غیر شاعرانہ بھی ہے اور غیر منطقی بھی ہے۔ قومیت بھی تو ایک محدود نظریۂ حیات ہے اور قومیت کی حد بندی جغرافیائی حدود کی پابند ہے۔ اسلامیت کے پیرو کار تمام ہندوستان کی آبادی سے کہیں زیادہ ہیں۔ افغانستان کے قوم پرست محض مٹھی بھر ہیں۔ تو پھر اسلامیت کس طرح قومیت سے زیادہ محدود ہوئی۔ کیا عاشقانہ شاعری جسمیں ایک عاشق اور ایک محبوب کے معاملات کا اظہار ہوتا ہے بہت محدود ہے؟ اور جب کسی نظم میں ایک کردار کے تاثرات کا اظہار کیا جائے تو وہ اس سے بھی محدود تر ہوگی۔ کیا شاعری بھی مردم شماری کی پابند ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ عشق فطرت انسانی کا خاصہ ہے تو کیا مذہبیت بھی عام ذہن انسانی کی ایک حالت نہیں۔

نہ جانے یہ اسلامیت کو شاعری کے منافی قرار دینے والے حضرات یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے شاعر ہومر، یونانی تمثیل نگار، ڈانٹے، کالیداس، ملٹن وغیرہ صنمیات، عیسائیت اور ہندومت کے عقاید کو اپنی شاعری میں شامل کرتے تھے اور ڈانٹے تو اپنی نظموں میں اسقدر متعصب ہے کہ اس نے دوسرے مذاہب کے لوگوں کو گالیاں دی ہیں۔

اقبال کی اسلامیت تعصب سے بہت دور ہے۔ لوئیس ڈکنسن کے ایک اعتراض کے جواب میں اقبال لکھتا ہے کہ "میں تمام انسانوں کو اخوت اور انسانیت کا سبق دیتا ہوں۔ مجھے اسلامی سماج میں چند ایسے خواص نظر آئے جو میرے نظریۂ حیات کے عین مطابق تھے۔ اسلئے میں نے اس بنے بنائے سماج کو اپنا مخاطب اول قرار دیا ہے کیونکہ ان کو اپنے ساتھ ملانا میرے لئے زیادہ آسان تھا۔ اسلامی سماج وطن، رنگ اور نسل کے تعصب سے آزاد ہے اس میں اخوت انسانی زیادہ نمایاں ہے"۔ تو گویا اقبال تمام بنی نوع انسان کو ایک کرنا چاہتا ہے۔ ان کو محدود گروہوں سے نکال کر عالمگیر برادری میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ جاوید نامہ میں اس نے قدیم ہندو بزرگوں کو

بھی وہی درجہ دیا ہے جو رومی اور دیگر فلاسفۂ اسلام کو دیا ہے :- اس نظم میں اس نے ہندوستان کی غلامی کی تصویر نہایت دردناک طریقے سے کھینچی ہے اور غدارانِ وطن کی مذمت کی ہے اور جعفر اور صادق کو کوستے ہوئے انہیں محض "ننگ دیں" ہی نہیں کہا۔ "ننگ آدم" اور "ننگ وطن" بھی قرار دیا ہے - وہ وطن کی آزادی کا مخالف نہیں۔ "وطنیت" کا مخالف ہے - اس وطنیت کا مخالف ہے جس نے گزشتہ سالوں میں اسقدر خونریز جنگوں کو تقویت دی ہے :- جو انسان کو انسان سے لڑا رہی ہے :-

(۲) — "اقبال کی شاعری میں موسیقیت نہیں" !

معترض نے موسیقیت کے لفظ کو چند مخصوص اور محدود معنوں میں استعمال کیا ہے۔
کیا موسیقیت سے مراد فقط ایسے الفاظ کا استعمال ہے جن میں میم نون کا غنہ پن پایا جائے ؟-
مثلاً داغ کا یہ مصرع ۔"کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں !" جیسے کوئی نامۂ محبوب، کو چوم رہا ہو۔
ظاہر ہے کہ اگر موضوع اس قسم کا ہو تو الفاظ کی اصوات بھی اسی طرح کی ہونی چاہئیں - اگر اقبال کی شاعری میں چوما چاٹی نہیں تو اس کے الفاظ کی اصوات بھی اس قسم کی نہیں ہوں گی -
مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا موسیقیت اسی ذہنی حالت تک محدود ہے ؟ کیا رجزیہ موسیقی اور رجزیہ شاعری کم درجے کا آرٹ ہے ؟-
شاعری میں موسیقیت سے مراد الفاظ کی اصوات اور الفاظ کے معانی کی مناسبت ہے
یہ درست ہے کہ اقبال کی شاعری میں رجزیہ جوش کی فراوانی ہے - اور اس کے الفاظ بھی اسی قسم کے ہیں - گوئٹے ۔ ملٹن ۔ ڈانٹے ۔ ہومر اور فردوسی کی موسیقیت بھی اسی طرح کی ہے -
مگر جب کبھی اقبال سنتا ہے تو میٹھی میٹھی لوریاں بھی سناتا ہے - آہنگ اصوات و معانی کے نمونے ملاحظہ ہوں ۔ سے

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے — مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

اسی کا دوسرا شعر ہے - پہلے مصرع میں ہنگامۂ نا و نوش کا ذکر ہے اسلئے الفاظ کی اصوات میں بھی اسی قسم کا کرارا پن ہے - دوسرے مصرع میں آرام طلبی ہے اس لئے اصوات میں بھی حروفِ علت اور لام میم نون کا پے بہ پے استعمال ہے سے

تمام رات تو ہنگامہ گستری میں کٹی   سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی !

"تمام لے ساقی" اور "نام لے ساقی" یعنی قافیہ ردیف کا ٹکڑا مصرع کی رفتار میں لغزشِ پا کا سا اثر پیدا کرتا ہے۔ خود ردیف میں تین ٹکڑے ہیں۔ لے اور سا اور قی۔ عروضی انہیں سبب خفیف کہتے ہیں اور قافیہ میں کشیدہ الف اور دو ساکن حروف کا پے بہ پے آنا اور میم کی ملائمت جس کے بعد ردیف میں لام کی نرم آواز اور کشیدہ یائے اور آخر میں پھر کشیدہ الف اور کشیدہ یائے۔ تا۔ لے۔ سا۔ قی !۔ ل، م !۔ ان تمام اصوات کے آہنگ سے جو کیفیات مرتب ہوتی ہیں۔ وہ الفاظ کے معانی کے اظہار میں مددگار ہیں۔

شاعری میں موسیقیت اسی کو کہتے ہیں۔ ٹھمری ٹپے کی موسیقیت اور شے ہے۔ "دریائے نیکر کا خرام" والی نظم شاعرانہ موسیقیت کے لئے مشہور ہے۔

ایک شام

(دریائے نیکر (ہائیڈل برگ) کے کنارے پر)

خاموش ہے چاندنی قمر کی   شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش   کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بےہوش ہو گئی ہے   آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے   نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے   یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا   قدرت ہے مراقبے میں گویا

اے دل ! تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

اور بالِ جبریل کی وہ نظمیہ غزل تو ہر کسی کی زبان پر ہے۔ جس کا ایک مصرعہ ہے۔ ع
اُودے اُودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن !

(۳۱) ۔ "اقبال کی شاعری میں منظرکشی مفقود ہے"

یہ اعتراض بھی پہلے اعتراض کی قبیل سے ہے ۔ یعنی یہ کہ اقبال اقبال ہے کوئی اور شاعر نہیں اور یہ کہ شاعری معترض کے ذہن کی طرح محدود ہونی چاہیئے ۔ چند مفروضات کی حامل ہونی چاہیئے ۔ یہ درست ہے کہ اقبال پتھروں ، درختوں اور دریاؤں کا پجاری نہیں ۔ انہیں جاندار نہیں سمجھتا ۔ خدائی طاقت مجسم نہیں مانتا مناظر قدرت کو پس منظر کی حیثیت دیتا ہے ۔ اس کے نزدیک انسان کے خیالات اور جذبات زیادہ اہم اور قابلِ توجہ ہیں ۔

اگر انسانیت شاعری کے منافی ہے اور شجر حجر پرستی ہی شاعری ہے تو پھر اقبال مجرم ہے مگر خود ساختہ مفروضات کی بنا پر شاعری کو جانچنا تنقید کے مبادی اصولوں سے ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے ۔

اقبال کی شاعری انسانی عظمت کی آئینہ دار ہے ۔ وہ انسان کو اشجار ہی سے نہیں بلکہ مشیت کردگار سے بھی زیادہ بلند سمجھتا ہے ۔ سہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ۔۔۔ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے !

ایسی شاعری فرقہ داری کیا عام روایتی مذہبیت سے بھی بالاتر ہے ۔

تاثیر

جوئے کہستاں

فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور ۔۔۔ ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی ۔۔۔ اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی ۔۔۔ بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رُکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ ۔۔۔ پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

(ساقی نامہ) ۔۔۔ اقبال

۴۔"اقبال غرور سکھاتا ہے، سختی اور درشتی سکھاتا ہے، رحم کے جذبات سے نفرت سکھاتا ہے"

یہ اعتراض غالباً اقبال کے چند ناشناس مداحوں کی تحریروں پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو شاید یہ شکایت باقی نہ رہے۔ (مندرجہ ذیل اشعار سب کے سب اقبال کی ایک کتاب "بال جبرئیل" سے منقول ہیں۔ مختلف کتابوں سے محض مطلب کے اشعار نقل نہیں کئے گئے)

اقبال نے اپنی دانست میں اس دنیا میں "زندگی بسر کرنے" کا بہترین طریقہ بتایا ہے۔ اسلئے کسی مداحِ اقبال کا یہ کہنا کہ وہ دین و دنیا، ملک و ملت سب سے بالا ہے محض پریشان گوئی ہے۔ اور کسی مخالف کا اس کے عام اشعار سے قطع نظر کرکے چند اشعار پر زور دینا اور اسے تنگدل ثابت کرنا ادبی بد دیانتی ہے۔

اقبال غرور بھی سکھاتا ہے اور انکسار و حلم بھی۔ سختی بھی سکھاتا ہے اور رحم و دلگدازی بھی؛ یہ دنیا ہی عالم اضداد ہے۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ بزم کا رنگ اور ہے رزم کا رنگ اور ہے۔ پہاڑوں میں دریا شور مچاتا ہوا تند رفتار ہوتا ہے اور میدان میں شیریں نوا و نرم رفتار۔ اور بہترین انسان کی یہی خصلت ہونی چاہیئے۔ بہترین انسان ؎

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو　　رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
اسکی امیدیں قلیل اسکے مقاصد جلیل　　اسکی ادا دلفریب اسکی نگہ دلنواز

اس کے جنگ و جدال کا انداز ؎　　کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

جس کا دل نرم نہیں جسکی آنکھوں میں آنسو نہیں وہ انسان نہیں ہے ؎

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن　　پُرکار و سخن ساز ہے؛ نمناک نہیں ہے

محض نرم دلی ہی نہیں بلکہ مروّت اور دلنوازی انسانیت کے لیئے لازمی ہیں ؎

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا　　مروّت حُسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

اور "خودی" بد دماغی کا نام نہیں ؎　　خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذتِ نیاز نہیں

اسکے چمن میں پھول اور کانٹے، اسکے کردار میں خودی اور بیخودی، اسکے مزاج میں عزتِ نفس اور نیازمندی سب کو مناسب دخل ہے۔ اور یہ محض میرا اپنا اندازہ نہیں اقبال خود کہتا ہے ؎ فطرت مری مانندِ نسیمِ سحری ہے　　رفتار ہے میری کبھی آہستہ کبھی تیز
پہناتا ہوں اطلس کی قبا لالہ و گل کو!　　کرتا ہوں سرِ خار کو سوزن کی طرح تیز

اب اگر کسی یک چشم کو سرِ خار ہی نظر آئے یا اطلسِ گل ہی تو یہ اقبال کے چمن زار کا نہیں نظر کا قصور ہے۔ — تاثیر

محمد مقبول احمد خان
لکچرار شعبہ انگریزی

اقبال کا نظریہ آرٹ

علامہ اقبال کی شاعری کے متعلق کسی صحیح اندازہ تک پہنچنا محال ہے جب تک کہ اقبال کا نظریہ آرٹ ذہن نشین نہ کر لیا جائے۔ اقبال نے آرٹ کا کوئی بالکل انوکھا اصول قائم تو نہیں کیا اور اب کرنا ممکن بھی نہیں ہو سکتا تھا البتہ اقبال نے آرٹ برائے زندگی کے نظریہ کو نئی زندگی بخشی ہے۔ جس سے آرٹ مستفید ہو کر اپنی ذات کو بقول اپٹن سنکلیر (Upton Sinclair) سرمایہ دارانہ تہذیب کے ادب برائے ادب کے نظریوں سے آزاد کر سکتے ہیں۔ اور زندگی اور ادب میں رابطہ قائم کر کے قوم وملت کی ذہنی و اقتصادی ترقی کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ اقبال کا نظریہ دورِ حاضرہ کے ان مفکروں سے بالکل مختلف ہے جو ادب کو زندگی کی پیچیدگیوں اور اس کے مخمصوں سے بری کرنا چاہتے ہیں۔ اور جن کے نزدیک ادب کا منتہائے نظر ایک ایسا مرمری محل تیار کرنا ہے جس میں انسان کو چند لمحوں کے لئے حوادثِ زندگی کے تھپیڑوں سے پناہ مل سکے۔ آرٹ کے بارے میں ایسے خیال رکھنے والے نقادوں کا جواب مشہور نقاد شاعری "کورٹ ہوپ" (Court hope) نے احسن طور پر دیا ہے فرماتے ہیں۔ کہ شاعر کے لئے واجب نہیں ہے کہ وہ اس دنیا کے اندوہگیں مناظر سے پرہیز کرتے ہوئے آرٹ کے خوشنما اور فرحت بخش باغات میں پناہ گزین ہو۔ اس شاعرانہ رہبانیت کے خلاف انہوں نے صدائے احتجاج بلند کی ہے۔

انگریزی زبان کے مشہور شاعر شیلے بھی کہتے ہیں کہ آرٹ تصویر زندگی ہے جس میں زندگی خوشتر نظر آتی ہے اور یہ تصویر زندگی کی منزلوں میں مشعلِ راہ کا کام دے سکتی ہے۔ اقبال کے نزدیک آرٹ کا زندگی سے گریز کرنا ایک مہلک غلطی ہے۔ اگر آرٹ کو زندگی کے پائندہ مسائل کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو تو اس کی وقعت محض ایک شررکی ہے جس کی زندگی چند لمحوں تک محدود ہے۔ آرٹ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کے سامنے ایک نصب العین پیش کرے جس سے اسکی زندگی کو بہتر بنانے کی صورت ہو سکے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس میں یہ صلاحیت بھی موجود ہو کہ وہ ایک نئی زندگی کی لہر پیدا کر سکے سہ

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے وچنگ و رباب

وہ آرٹ جو انسان کو زندگی سے بیزار کرے صحیح آرٹ نہیں ہو سکتا۔ یہ بات مخفی نہیں ہے کہ بلند اور اعلےٰ نصب العین شاعروں کا کلام یزدانی وجدان کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اس لئے شاعر کو اپنے تئیں زندگی کے بلند نصب العین سے علیحدہ سمجھنا آرٹ کے صحیح مقصد کو نظر انداز کرتا ہے اقبال بھی اسی بات پر مُصر ہے کہ دنیا میں قوموں کا اُبھرنا آرٹ کے دم سے وابستہ ہے۔

علامہ مرحوم کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا!
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وُہ گہر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وُہ بادِ سحر کیا!
بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وُہ ہنر کیا!

اقبال نے آرٹ کی بنیاد محض تخیل پر ہی نہیں رکھی ہے۔ کیونکہ یہ امر لازمی تھا کہ تخیل کی بے راہ روی شاعر کو زندگی سے کہیں دُور لے جائے اور حقائقِ حیات سے محروم رکھے۔ بعض شعرا اسی غلطی کے شکار ہوئے اور اپنے تئیں تخیل کی خوشنما بھول بھلیوں میں کھو بیٹھے۔ ایسے شاعروں کے متعلق قرآن حکیم میں ایک معنی خیز اشارہ ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَّهِيمُوْنَ۔ فی الواقع تخیل کی وادیوں میں سرگردان پھرنا گمراہی کا راستہ ہے۔ ایسے گمراہ انسانوں کو زندگی کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی اور اُن کے خیال میں وہی شعر آرٹ کا جزو ہے جو اُن کی آنکھوں سے تماشائے حیات کو چھپا کر انہیں دنیا و ما فیہا سے بالکل بے خبر اور بے نیاز کر دے ؎

ہے وُہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر — جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

اقبال نے آرٹ کی بنیاد کو خونِ جگر سے سینچنے کی تلقین کی ہے۔ دل کی کسک ہی وُہ چیز ہے جو شعر میں باعثِ سوز ہے۔ اس معیار پر اُترنے والے وہ اشعار ہو سکتے ہیں جو سامعین کے دلوں میں بھی وُہی کسک پیدا کر سکیں جو کہ شاعر کے دل میں محرک اشعار تھی۔ یہ آرٹ ممکن نہیں کہ زندگی کی کشمکشوں سے بے نیاز ہو سکے۔

علامہ فرماتے ہیں ؎

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل — خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود!

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

خونِ دل و جگر سے ہے مری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
مے خانۂ حافظ ہو کہ بتخانۂ بہزاد

ہنرورانِ ہند کے متعلق وہ اسی خونِ جگر کے جس کا دوسرا نام عشق و مستی ہے مفقود ہونے پر ارشاد فرماتے ہیں ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل اُن کا
اُن کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

اقبال نے آرٹ کے نظریہ میں ایک لطیف بات جو پیدا کی ہے وہ یہ ہے کہ ادب کو اپنے خودی کے پیغام کے ساتھ منسلک کر دیا۔ خودی سے ہی ماہرینِ فن ان سرمایہ داروں سے بے نیاز ہو سکتے ہیں جو اپنی دولت و وجاہت کے بل بوتے پر مفلس آرٹسٹ سے اپنی عظمت
ںولات سرمایہ داری کی نشر و اشاعت کرواتے ہیں۔ اس کا علاج مشہور و معروف مصنف سنکلیر نے سماجی نظام کی تبدیلیوں میں پایا اور اس کا مداوا علامہ مرحوم کے پیغام خودی میں بھی ہم پا سکتے ہیں۔ علامہ کے نزدیک جس آرٹ میں خودی کا عنصر نہیں وہ محض فسون و افسانہ ہے اور وہ قومیں جن کے ادب میں خودی مفقود ہے ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتیں۔

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ

ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے اُن کا کاشانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

اقبال نے اہرامِ مصر کی ابدیت سے یہی سبق اخذ کیا ہے۔

اس دشتِ جگر تاب کی خاموش فضائیں
فطرت نے فقط ریت کے ٹیلے کیے تعمیر

اہرام کی عظمت سے نگوں سار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر؟

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو
صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر؟

علامہ نے اپنے نظریہ میں ایک اور حیرت انگیز اضافہ کیا ہے جب وہ کہتے ہیں کہ آرٹ فطرت یعنی نیچر کا بھی غلام نہیں ہونا چاہیے چہ جائیکہ وہ کسی ایک جماعت کے زیرِ اثر ہو۔ ایک ہنرمند کے لئے نیچر کی کارفرمائیوں سے متاثر ہو کر اپنی خودی یا حقیقت کو ہاتھ سے کھو دینا بہت افسوسناک

ہے۔ چاہئے تو یہ کہ ہنرمند صیاد کی صورت میں کارفرما ہو نہ کہ نخچیر کے ہاتھوں صیدِ زبوں ہو کر رہ جائے۔
انسان کے اندر ایک ایسا عالم بے پایاں موجود ہے جس کا اظہار کہیں زیادہ ضروری ہے۔

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے　　　آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

اقبال کے نزدیک آرٹ میں جدت کا مادہ بھی احساس خودی سے ہی وابستہ ہے۔
علامہ کا خیال ہے کہ ایک چیز دلکش اور نورانی جب ہو گی کہ ہنرمند اسے اپنی نظر سے دیکھے۔ اور اپنے خیالات اور احساسات کا اسے مرکز بنائے۔ جب بھی ہنرمند نے اپنی خودی کو پس پشت نہ ڈال کر اس جہانِ رنگ و بو کو غور و فکر سے دیکھا اپنے اعجازِ ہنر سے فطرت کی دل آویزی کو چار چاند لگا دئے۔ ارشاد ہوتا ہے

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے　　　افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے　　　ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے　　　شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے

ہنرورانِ ہند

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اقبالؒ

بی ۔ڈی ۔ یل شرما
ایم ۔اے (علیگ)

برج نرائن چکبست اور اردو شاعری

اردو داں اصحاب میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو پنڈت برج نرائن چکبست کا نام نہ جانتا ہو۔ آپ کے بزرگوں کا اصل وطن لکھنؤ تھا۔ مگر آپ کی پیدائش کا شرف ۱۸۸۲ء میں فیض آباد کو حاصل ہوا۔ چکبست نے ابتدائی تعلیم و تربیت لکھنؤ ہی میں پائی اور اردو فارسی آپ کے مضامین خاص رہے۔ ۱۹۰۵ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور دو برس بعد ایل۔ایل۔بی کا امتحان پاس کر کے وکالت کو ذریعۂ معاش اختیار کیا۔ خداداد ذہانت کی وجہ سے اپنے پیشہ میں کامیابی حاصل کر کے ہم پیشہ لوگوں اور حکام کی نظروں میں عزت کی جگہ حاصل کی۔

۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمے کی پیروی کے سلسلہ میں رائے بریلی گئے ہوئے تھے۔ شام کے وقت جب واپس لوٹ رہے تھے۔ تو ریل کے ڈبے میں ہی دماغ پر فالج گرا۔ زبان بند ہوگئی۔ اور وہیں پر انتقال کیا۔ بعد میں آپ کے بڑے بھائی نعش کو موٹر میں لاد کر لکھنؤ لائے۔ مرزا کاظم حسین محشر مرحوم لکھنوی نے انہی کے مشہور مصرعہ سے تاریخ وفات نکالی ہے۔ شعر حسب ذیل ہے ؎

ان کے ہی مصرع سے تاریخ ہے ہمراہ عزا موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا ۱۳۴۴ھ

چکبست کی وفات کی خبر سے دنیائے ادب میں ایک کہرام مچ گیا۔ سینکڑوں ماتمی جلسے ہوئے۔ دوست احباب نے دل سے گریہ و ماتم کیا۔ آخر وہ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ فروری مارچ ۱۹۲۶ء میں مرحوم کی ذاتی صفات اور شاعری کے متعلق ہندوستان کے مختلف ادبی رسالوں اور اخباروں میں بیسوں مضامین شائع ہوئے۔ ان میں سے "زمانہ" کانپور "مرقع" لکھنؤ۔ "بیدار" الہ آباد۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خود بقول چکبست۔

شعر

دو مدد مرنے پہ مرے داد و فا دیتے ہیں ہائے کس وقت محبت کا صلہ دیتے ہیں

چکبست اپنے عہد میں اردو ادب کا ایک بڑا محب تھا۔ بڑا نثار تھا۔ اعلیٰ درجے کا نقاد اور سب سے افضل وہ ایک شاعر تھا۔ جس نے مولانا حالی اور آزاد کے لگائے ہوئے پودے کی بڑے جوش اور انہماک سے آبیاری کی۔ جس کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں ستا کر ہم اور آپ سب کے دلوں سے ان بزرگوں کے حق میں دعائیں نکلتی ہیں۔ چکبست کی شخصیت تاریخ ادب میں نہایت اہم ہے۔ جس کا صحیح اندازہ اتنی جلدی لگانا ایک مشکل امر ہے۔ اور خصوصاً اس دور میں جبکہ ملک ایک عجیب و غریب انقلاب عظیم سے

گذر رہا ہے۔

پنڈت چکبست کی پیدائش سے پہلے ہندوستان ایک بے حسی و بے کسی کی حالت میں مبتلا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے حادثہ نے محض ہماری سیاسی طاقت کو ہی منتشر و پراگندہ نہیں کیا۔ بلکہ ہماری قومی خودداری اور شیرازے کو بھی تباہ کرڈالا تھا۔ ہمارا کلچر۔ ہماری تہذیب عجائب خانوں کا سامان بن چکے تھے۔ مغربی سیلاب زوروں پر تھا۔ اور مشرقی تمدن خس و خاشاک بن کر تند اور خوفناک لہروں کی لپیٹ میں آچکا تھا دلوں پر کچھ اسقدر خوف وہراس طاری ہوگیا تھا کہ دوبارہ اپنی کھوئی ہوئی تہذیب و کلچر کی طرف عود کرنا ایک بڑی مہم تھی یہی نہیں بلکہ ہر شعبۂ زندگی کا ایسا ہی حال تھا۔ فضائے شعر پر بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ محفلیں سونی اور بے رونق پڑ چکی تھیں۔ مگر انیسویں صدی کے آخری حصہ میں جو نئی پود اُگی اُن کے دل و دماغ سے ان حادثات ہیبتناک کا ڈر کم ہونے لگا۔ انہوں نے مغرب کے جادو کو پہچان کر تدارک کیلئے آواز بلند کی۔ اور ہندوستان میں نئے ولولوں اور نئی امنگوں کا بیج بو دیا۔ چکبست بھی انہیں میں سے ایک تھے۔ ان کی تربیت لکھنو جیسی جگہ میں ہوئی تھی۔ جو سلاطین اودہ کے عہد میں پرانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ لکھنو میں ابھی ایسے لوگ موجود تھے۔ جنہوں نے پرانی محفلوں کی رونق کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوا تھا۔ اس ماحول نے چکبست کے حساس دل پر گہرا اثر کیا۔ اگرچہ انہوں نے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی مگر وہ مغرب کی رو میں نہیں بہ گئے۔ انہوں نے مغرب کا مطالعہ ضرور کیا۔ مگر مشرق کی قربانی پر نہیں بلکہ مشرق کی روشنی میں۔ اور اس کے ریاکارانہ تار و پود کی ماہیت کا راز اپنی شعر و شاعری میں افشا کیا۔

چکبست کو قدرت نے مذاق شعر اوائل عمر ہی سے ودیعت کر رکھا تھا۔ غزل اُسوقت بھی تمام اصناف شاعری کی سرتاج مانی جاتی تھی۔ چنانچہ چکبست نے بھی بارہ برس کی عمر میں پہلی غزل لکھ کر قدردانان سخن سے تحسین و آفرین حاصل کی۔ آپکا شعور شعر عمر کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا گیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اہل سخن نے انہیں اپنی محفلوں میں قدر و منزلت سے جگہ دی۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ اپنے پیشہ وکالت سے کم فرصت ملنے کی وجہ سے بہت کم مشاعروں میں حصہ لیتے تھے۔ مگر لکھنو کے لوگوں کا اشتیاق اسقدر بڑھا ہوا تھا کہ اُن کے بغیر ہر محفل سونی ہوتی تھی۔

چکبست کو ابتدا ہی سے اساتذہ کا کلام پڑھنے کا شوق تھا۔ اور خاص طور پر آتش۔ غالب اور انیس کا کلام بے حد پسند خاطر تھا۔ اپنے اشعار میں ان شعرا کے علاوہ نسیم کا بھی تتبع کیا ہے۔ چنانچہ بقول شخصے آپنے صنائع بدائع مثنوی گلزار نسیم سے اخذ کئے۔ سلاست و روانی، تشبیہات و استعارات

میر انیس کے مرثیوں کے مطالعہ سے حاصل کئے۔ آتش کے تغزل نے آپ کے کلام میں گرمی پیدا کی اور غالب کے کلام سے تخیل کی بلند پروازی لی۔ الغرض ان سب خصوصیات نے چکبست کے کلام کو خلعتِ بقائے دوام سے مزین کیا۔ حضرت چکبست نے کسی کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ ان کی زندگی اور اشعار پر اگر کسی کا زیادہ اثر ہوا تو وہ پنڈت بشن نرائن در صاحب ہیں۔ جن سے انہیں کمال عقیدت تھی۔ آپ ظاہری نام و نمود سے ہمیشہ بھاگتے تھے۔ اور اسی وجہ سے آپنے کوئی تخلص اختیار نہ کیا۔ اُنہی کے الفاظ میں سے

ذکر کیوں آئیگا بزم شعرا میں اپنا   میں تخلص کا بھی دنیا میں گنہگار نہیں

انہیں دراصل اس نمود کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ تو اصل معنوں میں تلمیذ الرحمان تھے۔ اور شاید اگر ایسا نہ ہوتا تو اُن کے مضامین اور اُن کے اشعار میں ایک جدت اور نرالی فکر پرواز نہ ملتی۔ اُنہوں نے بہت حد تک قدیم اور فرسودہ شاعری کے خلاف بغاوت کرکے نئی نئی راہیں نکالی ہیں۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔ سے

نیا مسلک نیا رنگِ سخن ایجاد کرتے ہیں   عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

یہ ایک حقیقت ہے کہ اُنہوں نے پُرانے شعرا سے مختلف راستے اختیار کئے۔ اور گل و بلبل، ہجر و وصل، شیرین فرہاد اور لیلے مجنون کے پُرانے قصوں کو بالائی طاق رکھ کر ہندوستانی اور خالص ہندوستانی قصوں اور واقعات کو اپنے کلام میں جگہ دی۔ یہاں تک کہ اُن کے استعارے، تشبیہیں اور مناظر سبھی ایسے ہیں جو اپنے ہی وطن سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کبھی وہ ہندو اور مسلمانوں کو کہیں جوش دلانا چاہتے ہیں۔ تو انہی کے بزرگوں ارجن و بھیشم، اکبر و پرتاب، گوتم و سرمد اور گنگا جمنا اور ہمالیہ کا ذکر کرتے ہیں۔ دیکھئے جب چکبست وطن کی خدمت کے لئے پکارتے ہیں۔ تو دونوں قوموں کے نوجوانوں کو کن کن الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں۔ اُن کا یہ انداز بیان سب سے نمایاں خصوصیت ہے

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہند و ہشیار   اندھیری رات ہے۔ کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار   تو زیر موج فنا ہوگا آبرو کا مزار
مٹے گی قوم، یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

دکھا دو جوہر اسلام اے مسلما نو   وقار قوم گیا، قوم کے نگہبان لو
ستون ملک کے ہو، قدر قومیت جانو   جفا وطن پہ ہے، فرض وفا کو پہچانو
نبی کے خلق و مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شانِ حمیت کی یادگار ہو تم

یہ قومی جذبہ اور نئی شاہراہوں پر گامزن ہونا چکبست نے خواجہ الطاف حسین حالی اور مولانا آزاد سے ورثہ میں پایا اور محض الفاظ کی بھول بھلیوں سے آزاد ہوکر نت نئے مضامین باندھکر جدید قومی ترقی کے خیالات کو نظم کرکے نئے دَور کا آغاز کیا۔ مگر یہاں بھی انہوں نے لکھنو کی مستند زبان و بیان کی صفائی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مولانا حالی کی طرح زبان کو سلیس بنانے پر زور لگایا اور ہندی کے سبک اور مانوس الفاظ کو نظم میں داخل کرکے شگفتگی پیدا کی۔

یوں تو چکبست کے ہاں ہر صنف شاعری یعنی غزل، رباعی، مرثیہ اور مختلف اشعار ملتے ہیں۔ مگر اُن کے مجموعہ کلام صبح وطن میں نظموں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ان نظموں میں مناظر کی تصویر کشی، تاریخی واقعات کا بیان اور اصلاحی ترغیب وغیرہ پر مضمون ملتے ہیں۔ مگر ان نظموں کا محرک حب الوطنی کا جذبہ ہے۔ جو شروع سے لیکر آخر تک برابر ملتا ہے۔ چکبست سے پہلے شعراء کے کلام میں بھی وطن کا لفظ ملتا ہے۔ مگر وہ چکبست کے وطن سے مختلف تھا۔ وہ عالم غربت کی بیکسی کی یادِ وطن ہے۔ جو محض اپنی جنم بھومی کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ مثلاً غالب کا شعر ہے۔ شعر

کرتے کس مُنہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں

چکبست کے یہاں وطنیت کا مفہوم انگریزی لفظ Patriotism کے مترادف ہے۔ جو قوموں کی ترقی کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ اُن کے ہر شعر سے وطنیت کی خوشبو آتی ہے۔ ہمارے ملک میں آج جس پُر شور، تنگ نظر اور تعصب پرور قومیت کا دَور دَورہ ہے چکبست کی شاعری اُس کا ردِ عمل ہے۔ وہ ہندوستان کو ہندو مسلمان دونوں کا ملک اور وطن سمجھتے ہیں۔ اور اسکی آزادی اور بہتری کے لئے یکساں طور پر اپیل کرتے ہیں گو اُن کے اشعار موجودہ انقلاب پسند شعراء کے شعروں کی طرح آتش بار نہیں ہیں۔ جس کا سبب زمانے اور خیالات کا تغیر ہے۔ مگر پھر بھی چکبست آزادی کی دیوی کے اتنے ہی پجاری ہیں۔ جس قدر شاید موجودہ وقت کے علمبرداران حریت۔ وہ اس لَے میں اسقدر مگن تھے۔ کہ وہ ہر اُس شخص کو جو وطن کے لئے قربانی کرنا نہیں چاہتا مردہ تصور کرتے ہیں۔ ذرا اُنہی کے الفاظ میں سُنئے۔

مٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے
لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے نہ جوش کھائے جو غیرت سے وہ لہو کیا ہے

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

اس کے علاوہ چونکہ وُہ ایک ایسے دَور میں پیدا ہوئے تھے۔ جبکہ ماضی کی فاتحہ پڑھی جارہی تھی۔ اور مستقبل کا آغاز تھا۔ اس کا چکبست پر اثر ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وُہ نہ تو بالکل نئی چیزوں میں دل کھو بیٹھے اور نہ ہی ماضی کے دھندلکے میں پھنسے رہے۔ قومی آزادی کے جذبہ میں بھی وُہ "لبرل" رہے اور برطانیہ سے تعلق قائم رکھنے کے حامی تھے۔ کم از کم قطع تعلق کا خیال اُن کے دل کے کسی گوشہ میں جاگزیں نہ تھا۔ وُہ ملکی آزادی اور حکومت خود مختاری کے طلبگار تھے۔ اور ساتھ ہی برطانوی جمہوری نظام کو ملک میں برقرار رکھنے کے حق میں تھے۔ ۱۹۱۶ء کے کانگرس کے اجلاس کے لئے انہوں نے ایک نظم لکھی تھی۔ جس کا آخری شعر ہے۔

برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا ہم ہونگے عیش ہوگا اور "ہوم رُول" ہوگا

اور پھر کہیں دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رُول کے بدلے

دراصل وُہ قدرتی طور پر ایک وسیع القلب انسان واقع ہوئے تھے۔ وُہ تنگ نظری کو ایک گناہ خیال کرتے تھے۔ وُہ ہندو تھے۔ اور اگر صرف ہندوؤں کے متعلق یا ہندو فلسفہ پر ہی نظمیں کہتے تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ مگر وُہ اعتدال کو ہاتھ سے ہرگز نہیں جانے دیتے تھے۔ آخر وُہ ایسا کیوں نہ کرتے۔ وہ تو عرصہ سے اپنا مسلک مقرر کر چکے تھے۔

ہر ذرّہ خاک کی ہے مرا مونس و ہمدم دُنیا جسے کہتے ہیں وُہ کاشانہ ہے میرا

جس جا ہو خوشی وُہ ہے مجھے منزل راحت جس گھر میں ہو ماتم وُہ عزاخانہ ہے میرا

جس گوشۂ دُنیا میں پرستش ہو وفا کی کعبہ ہے وُہی اور وُہی بتخانہ ہے میرا

اور ہم لوگوں کی یہ خوش قسمتی ہے۔ کہ آخری وقت تک وُہ اسی مسلک پر قائم رہے۔ مگر اس فراخدلی اور وسیع نظری سے بھی زیادہ ملکی جذبہ تھا۔ جو قدرت نے کوٹ کوٹ کر اُن کے دل میں بھر رکھا تھا۔ وُہ اسے کسی حال میں بھی اپنے سے جدا نہیں کر سکتے تھے۔ دیکھئے اپنی مشہور نظم "خاکِ ہند" میں ہندوستان کی عظمت و شان کو کس طرح بیان کرتے ہیں۔

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے

تیری جبین سے طورِ حسنِ ازل عیاں ہے اللہ ری زیب و زینت کیا اوجِ عزوشاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پُرضیا کی

کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

پھر اسی نظم میں کہتے ہیں۔

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو | سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو | سینچا لہو سے اپنے راناؔ نے اس چمن کو

سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا انکی ہڈیاں ہیں

چکبست نے اس قومی جذبے کو یہیں تک محدود نہیں رکھا ہے۔ بلکہ جہاں بھی اُن کا داؤ چل گیا اس عنصر کو داخل کر دیا۔ اگرچہ انہوں نے غزلیں بہت کم لکھی ہیں۔ مگر پھر بھی صرف ایک آدھ ہی ایسی غزل ملے گی جس میں وطن، عشق وطن، قوم اور گرفتاریٔ قوم کے راگ کو نہیں گایا ہوگا۔ یا قومی درد کو ظاہر نہیں کیا ہوگا۔ مثلاً مختلف غزلوں کے اشعار ہیں۔

دل کئے تسخیر بخشا فیض روحانی مجھے | حب قومی ہوگیا نقش سلیمانی مجھے
قوم کا غم مول لیکر دل کا یہ عالم ہوا | یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

روشن دل ویران ہے محبت سے وطن کی | یا جلوۂ مہتاب ہے اُجڑے ہوئے گھر میں

کچھ ایسا پاس غیرت اُٹھ گیا اس عہد پرفن میں | کہ زیور ہوگیا طوق غلامی اپنی گردن میں
نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں | وطن کی آبرو اہل وطن برباد کرتے ہیں
پرانی کاوشیں دیر و حرم کی مٹتی جاتی ہیں | نئی تہذیب کے جھگڑے ہیں اب شیخ و برہمن میں

خالص غزل کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔ دیکھئے حضرت چکبست کی بلندیٔ خیال اور فکر پرواز کس کس آسمان کے تارے توڑ کر لاتی ہے۔ مگر خیال رہے کہ یہاں بھی شاعر غزل کو محض حسن و عشق کی داستان سے الگ رکھتا ہے۔ بلکہ ہر شعر سے فلسفہ اور اخلاق ٹپکتا ہے۔

گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک | ہے اسے طرۂ دستار غریباں ہونا

نظر آتا ہے فقیری میں تماشائے جہاں | ٹھیکرا بھیک کا جمشید کا پیمانہ ہے

درد الفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے | خاک کے پتلے اسی جوہر سے انساں ہوگئے

صدا دیتا ہے یہ میرا گریباں چاک ہونے پر ہزاروں پیرہن پیدا کرینگی دھجیاں میری

دیکھئے چکبست اپنے زورِ بیان اور بلندیٔ خیال سے زندگی اور موت ایسے دقیق مسئلے کو کس آسانی سے اپنے اشعار میں حل کر دیتے ہیں۔ شعر

زندگی کیا ہے؟ عناصر کا ظہورِ ترتیب موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

پھر موت کو ایک دوسری طرح بیان کر کے اپنے زور بیان سے موت کے خوف کو دلوں پر سے ہٹا کر اس سے بے نیاز کرنا چاہتے ہیں۔ موت جیسے خشک موضوع میں زندگی داخل کر دینا انہی کا حصہ ہے شعر

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

چکبست کی عظمت بحیثیت شاعر اُن کے مرثیوں اور نوحوں سے بہت بلند ہے۔ جو انہوں نے مختلف موقعوں پر اپنے عہد کے ملکی رہنماؤں اور اپنے احباب کی موت پر لکھے ہیں۔ یہاں انہوں نے اپنے دلی جذباتِ غم و اندوہ کا درد انگیز الفاظ میں اظہار کیا ہے۔ یہ دراصل معمولی رسمی مرثئے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن میں انہوں نے اپنے اور اہلِ وطن کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ ہر سردارِ قوم کے مرثیہ میں اُس کے اوصاف و خصائل نمایاں کرنے کے علاوہ انکی زندگی کے کارناموں کا عکس بھی پیش کیا گیا ہے۔ جس سے شاعر کے جوشِ عقیدت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ مرثئے رسمی نہیں بلکہ دل سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور دل ہی میں جا کر بیٹھتے ہیں۔ دیکھئے گوپال کرشن گوکھلے کا ماتم کس طرح کرتے ہیں۔

اجل کے دام میں آتا ہے یوں تو عالم کو مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو
جنازہ ہند کا گھر سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تری چتا میں جلتا ہے

پھر ذرا چکبست کے الفاظ میں گوکھلے کی ملکی خدمات کا ذکر سنئے۔

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کے ساتھ سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ
چُنے رفاہ کے گل حسنِ انتخاب کے ساتھ شباب قوم کا چمکا تیرے شباب کے ساتھ
جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے

جب حضرت چکبست بال گنگا دھر تلک کا مرثیہ لکھنے بیٹھتے ہیں۔ تو اس کو ایک نئے پیرایہ میں بیان کرتے ہیں سردارِ قوم کی وفات کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی تلقین نہیں کرتے بلکہ مرثیہ میں ہی قوم کیلئے

ایک نیا پروگرام پیش کرتے ہیں۔

موت نے رات کے پردہ میں کیا کیسا وار | روشنی صبح کی ہے یا کہ ہے ماتم کا غبار
معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار | طنطنہ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار

بیکسی چھائی ہے تقدیر پھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

آخر میں کیا خوب کہا ہے۔

شور ماتم نہ ہو جھنکار ہو زنجیروں کی | چاہیئے قوم کے بھیشم کو چتا تیروں کی

پنڈت بشن نرائن در کے ساتھ تو حضرت چکبست کو روحانی عقیدت تھی۔ دیکھئے اُن کے مرثیہ میں ان کی خوبیوں کو کس طرح بیان کرتے ہیں۔

دل محبت پہ فدا آنکھ مروّت سے غنی | تجھ کو دشمن کی بھی منظور نہ تھی دل شکنی
مگر انصاف کے حق میں ہو اگر نیش زنی | پھر نہ تھا تجھ سے زیادہ کوئی جرأت کا دھنی

شیر نر معرکۂ عام کی سرگرمی میں
طفل معصوم سے ملتا ہوا دل نرمی میں

جن لوگوں کو پنڈت بشن نرائن در کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا شرف ملا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ چکبست نے اپنے اشعار میں اپنے ہیرو کی حقیقی تصویر پیش کی تھی۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب تنہا رسالہ الناظر ۱۹۳۶ء میں چکبست کے کلام کے نقائص گناتے ہوئے مرثیہ کے متعلق فرماتے ہیں "کہ ایک یا دو نوحوں کو چھوڑ کر آپ نے جس قدر نوحے لکھے ہیں شعروں کے اندر (ہیرو کا) نام نہیں آیا۔ اگر عنوان نہ لکھا جاتا۔ تو پتہ نہ چلتا کہ آپ نے کس کا نوحہ لکھا ہے اُن کے صفات عام طریقے سے بیان کئے ہیں۔ جو دوسروں میں بھی ملتے ہیں۔ اگر گوکھلے، تلک اور رانا ڈے تینوں کے مرثئے مثال کے طور پر ایک دوسرے کے لئے ادلے بدلے جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا" سمجھ میں نہیں آتا کہ فاضل نقاد نے ان تینوں بزرگوں کے مرثیوں میں کیوں فرق نہ پایا۔ یہاں ایک کی صفات اور کارنامے دوسرے سے ہرگز نہیں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر ایک مرثیہ اپنے رنگ میں ایک خاص پہلو لئے ہوئے ہے۔ نامعلوم نقاد نے کس عالم میں یہ لکھ دیا۔ کہ تینوں کے مرثیوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

حضرت چکبست کی نیچرل یا اُن نظموں کی تعداد جن میں مناظر قدرت کا بیان ہو بہت کم ہیں۔

مگر جسقدر ہیں اُن میں حق استادی ادا کیا ہے۔ آخر ایسا کیوں نہ ہوتا۔ اُن کی حاس طبیعت نے فطرت کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہ نظمیں پھول، کشمیر، جلوۂ صبح اور سیر ڈیرہ دون ہیں۔ ان سب میں اعلیٰ تخیل اور بندش الفاظ بڑے سے بڑے شاعر کی نظموں سے لگا کھاتے ہیں۔ پرانی تشبیہوں اور تمثیلوں کو یہاں بالکل دخل نہیں۔

ذرا نظم مرقعِ عبرت سے کشمیر کا منظر ملاحظہ ہو۔ جن لوگوں کو کشمیر آنے کا موقعہ ملا ہے۔ وُہ ان اشعار کے مطالعہ سے کشمیر کی پُرلطف ہواؤں، ملاحوں کے گانوں، جھیل ڈل کے منظر، بادل کے اُڑتے ہوئے گالوں سے دوبارہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ بقول شخصے چکبست نے ان اشعار میں کشمیر کو اٹھا کر لا رکھا ہے۔ جن کے پڑھنے سے آدمی اپنے آپ کو کشمیر میں پاتا ہے۔ کیا خوب تصویر کشی کی ہے۔

وُہ موج ہوا کا حرکت ابر کو دینا — چشموں سے پہاڑوں کے وُہ اُڑتا ہوا چھینا

گاتے ہوئے ملاحوں کا وُہ کشتیاں کھینا — ڈل کا وُہ سرِ شام اُدھر کروٹیں لینا

وُہ عکس چراغوں کا جھلکتا نظر آتا

پانی کا ستارہ بھی چمکتا نظر آتا

پھر اسی نظم میں ملاحظہ ہو۔

وُہ صبح کو کہسار کے پھولوں کا مہکنا — وُہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا

گردوں پہ شفق، کوہ پہ لالے کا مہکنا — مستوں کی طرح ابر کے ٹکڑوں کا بہکنا

ہر پھول کی جنبش سے عیاں ناز پری کا

چلنا وُہ دبے پاؤں نسیم سحری کا

دیکھا چکبست حسین ترکیبوں، نادر تشبیہوں اور خوبصورت الفاظ کے استعمال کی کتنی مہارت رکھتے ہیں۔ اس نظم کے دوسرے مقام پر کمال خوبی سے نئے قافیوں میں قدرتی مناظر کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔

میوؤں سے گرانبار وُہ اشجار کے ڈالے — بکھرے ہوئے وُہ دامنِ کہسار پہ لالے

اُڑتے ہوئے بالائے ہوا برف کے جھالے — دیکھے جو کوئی دُور سے ہیں رُوئی کے گالے

وُہ ابر کے ٹکڑوں کا تماشہ سبزہ زاروں میں

جھرنوں کی صدائیں وُہ پہاڑوں کے دروں میں

اب لگے ہاتھوں پھول کا بیان بھی سُن لیجئے اور دیکھئے حضرت چکبست کی نوکِ قلم اس کے حسن کو کسطرح دوبالا کر دیتی ہے۔

یا باغ میں کھلتا ہے دمِ صبح گُلِ تر — کیا کیا لئے ہوتے نہیں اعزاز میسّر
بنتا ہے عروسانِ جہاں کیلئے زیور — دستار میں نوشہ کے رہا کرتا ہے اکثر

لیکن نہ کبھی وضع پہ اس ڈھنگ سے دیکھا
بیکس کی لحد پر اسے جس رنگ سے دیکھا

حضرت چکبست کشمیری نژاد تھے۔ اور اپنے آبائی وطن کشمیر پر نازاں تھے۔ جب آپ پہلی دفعہ کشمیر آئے۔ تو یہاں کی ہر ایک چیز سے متاثر ہو کر لوٹے۔ اور یہی ایک قدرتی اور غیر قدرتی شاعر میں بڑا فرق ہے پنڈت جی کشمیر آتے وقت راستہ میں کسی چشمہ سے پانی پی کر اس واقعہ کو ایک شعر میں یوں بیان فرماتے ہیں۔

ذرّہ ذرّہ ہے میرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھروں کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

وادیٔ دیرہ دون کی سیر کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

سُنا جو کرتے تھے وہ باغ پُر فضا ہے یہی — اگر پہاڑ میں جنت تو راستہ ہے یہی
کیا نہیں اسے غارت بشر کی صنعت نے — یہ سبزہ زار سجایا ہے دستِ قدرت نے

چکبست کی سوشل نظموں میں بھی آپ کا مسلک اعتدال پسند رہا ہے۔ اُن کے یہاں افراط و تفریط کا ہرگز گذر نہیں ہے۔ آپ کی نظم "پھول مالا" اسکی بہترین مثال ہے جس میں لڑکیوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز — داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں — ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
رُخ سے پردہ کو اُٹھایا تو بہت خوب کیا — پردہ شرم کو دل سے نہ اُٹھانا ہرگز
اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں — یہ ہیں معصوم انہیں بھول نہ جانا ہرگز

ہم تمہیں بھول گئے اسکی سزا پاتے ہیں
تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

آج بھی بہت سے نیک لوگ شراب کی بندش کے حق میں اپنا زور لگا رہے ہیں۔ چکبست نے بھی اس موذی کی مذمت کی ہے۔

خمارِ مرگ جو لائے وہ ہے سُرور اس کا — سیاہ قلب کو کر دے جو ہے وہ نور اس کا
لگائے آگ کلیجہ میں جو وہ آب ہے یہ — کرے جو طرفہ قیامت وہ آفتاب ہے یہ

پھر کہیں دوسری جگہ فرمایا ہے۔ شعر ؎

زباں کے واسطے گو رشک انگبیں ہے یہ
مگر جگر کے لئے آب آتشیں ہے یہ

اسی طرح اپنی مشہور نظم "برق اصلاح" میں جو آپ نے کشمیری کانفرنس ۱۹۱۰ء میں پڑھی تھی ازدواج بیوہ کی حمایت کر کے ہندو سوسائٹی پر سے ایک بڑی کڑی کو اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں بھی چکبست اپنے خاص طرز کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ہیں۔

یوں تو چکبست کا تمام کلام اپنے عہد کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ جو اس دور کی روش، ملک کے جذبۂ وطنیت، مختلف رہبران قوم و ملت کی وفات اور ان کے حالات اور اوصاف پر گہری روشنی ڈالتی ہے۔ مگر ان کی دو نظمیں بالکل تاریخی نوعیت کی ہیں۔ اول 'رامائن کا ایک سین'، اور دوم آصف الدولہ کا امام باڑہ لکھنؤ"۔ اول الذکر نظم میں رامائن کے اس حصہ کا بیان ہے جب کہ سری رام چندر جی کو بن باس کا حکم مل چکا ہے۔ بن جانے کی سب تیاریاں ہو چکی ہیں۔ اور یہاں سری رام چندر اپنی ماتا سے آگیا طلب کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ چکبست کی دیگر بہت سی نظموں کی طرح یہ نظم بھی مسدس کی شکل میں ہے۔ جس میں انیس کے مرثیوں کا رنگ نمایاں ہے۔ اس صنف میں چکبست نے بڑا زور قلم دکھایا ہے۔ اور بہت کامیاب رہے ہیں۔ ذرا انہی کے مؤثر اور درد انگیز الفاظ میں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال — خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال — سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں ہے تصویر سنگ ہے

ماں کی مامتا مشہور ہے۔ آخر وہ آبدیدہ ہو کر اپنے پیارے راج دلارے سے مخاطب ہوتی ہے۔

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں — میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں — لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن کو آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

تمام نظم پڑھ جائیے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت چکبست نے واقعی ان اشعار میں ایک ماں کی مامتا کی

ماں کی درد بھری کہانی کو بیان کیا ہے۔ کون ماں ہے جو اپنے بچے اور خاص طور پر پیارے لاڈلے بچے کو اپنے سے جدا کرنا گوارا کر سکتی ہے۔ چکبست نے سارا سین اسی انداز میں بیان کیا ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر وہ پوری رامائن اسی طرح لکھ ڈالتے۔ اور اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ کر جاتے۔ مگر افسوس زندگی نے وفا نہ کی۔

نظم "امام باڑہ" سے اُن کی غیر متعصب فطرت کا اظہار ہوتا ہے۔ جب حضرت چکبست دوسرے مذہب والوں کی کوئی شاندار چیز دیکھتے ہیں۔ تو اُن کا دل ایک معصوم بچے کی طرح حقیقت کو ببانگ دُہل سراہنے لگتا ہے۔ اس نظم سے شاعر کی مذہب اسلام کی روایات، رسوم اور عقاید کے متعلق کامل واقفیت و آگاہی اور انتہائی فراخدلی اور صلح جوئی کا ثبوت ملتا ہے۔

جس کے فیضانِ حکومت کا کرشمہ ہے یہ اُس کے سایہ میں ہے سویا ہوا وہ خلق نواز

اُس کی ہمت کی بلندی ہے بلندی اسکی اُس کے اخلاق کی وسعت کا ہے اس میں انداز

جب زیارت کو محرّم میں بشر آتے ہیں چاندنی رات میں آتی ہے فلک سے آواز

بے ادب پا منہ ایں جا کہ عجب درگاہ است
سجدہ گاہ ملک و روضۂ شہنشاہ است

پنڈت چکبست محض ایک اردو شاعر ہی نہ تھے۔ بلکہ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اردو کے ایک بلند پایہ نثار اور بڑے نقاد تھے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ تھوڑے سرمایہ کے باوجود انہیں دربار ادب میں اعلیٰ جگہ دی گئی ہے۔ حضرت چکبست خود "صبح امید" کے ایڈیٹر تھے۔ اور آپ کے مضامین ہندوستان کے مشہور رسالوں اور اخباروں میں چھپتے تھے۔ جنہیں اہل ملک نہایت شوق اور قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اُن کی زبان لکھنو کی اعلےٰ زبان کا ایک نمونہ ہے۔ جو نہایت متین، معنی خیز، روشن اور روزمرّہ کے مطابق تھی۔ اُن کے مضامین فنِ مضمون نگاری کی ایک اعلیٰ تمثیل ہیں۔ اُن کی نظر ہمیشہ اونچی، صحیح اور منصفانہ رہی اور اعتدال کو کہیں بھی نہیں بھولتے تھے۔ اسکی مثال معرکہ شرر و چکبست اچھی دلیل ہے۔ یہاں وہ ذاتی حملوں کے باوجود اشتعال کو نزدیک تک نہیں آنے دیتے تھے۔ اور ایک حقیقی نقاد کی طرح نہایت انکساری اور وسیع النظری سے جواب دیتے تھے۔ آخر وہ ایسا کیوں نہ کرتے انہی کا شعر ہے۔

اُلجھ پڑوں کسی دامن سے میں وہ خار نہیں
وہ پھول ہوں جو کسی کے گلے کا ہار نہیں

آخر میں میں جناب پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی کے الفاظ پر ختم کرتا ہوں۔ جو انہوں نے تھوڑا عرصہ ہوا پنڈت برج نرائن چکبست کے بارے میں ارشاد فرمائے تھے۔ "کہ جو شعرا اردو شاعری کو ارتقائے قوم اور تہذیب اخلاق کا آلہ بنانا چاہتے ہیں ان میں چکبست سب سے آگے ہیں۔"

~~~

اُردو ہندوستان سے باہر کسی ملک کی زبان نہیں۔ جو ہندوستانی باہر جا کر آباد ہو گئے ہیں وُہی اُردو بولتے ہیں اور اُنہوں نے البتہ اپنے ہم وطنوں کو اُردو سکھا دی ہے ورنہ اُردو ہندوستان کے لئے ویسی ہی "دیسی" اور "ملکی" ہے جیسی کہ بنگالی، گجراتی، مرہٹی یا تامل! اُردو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور ہندوستانیوں ہی کے ہاتھوں اسکی پرورش ہوئی جن میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہیں۔ اسکی بنیادی ساخت اور اسکا صوتیاتی اور صوریاتی نظام سب ہندوستانی ہے۔ اور اسکی بالائی ساخت میں تو ہندی سے کہیں زیادہ فراخدلی پائی جاتی ہے کیونکہ اس کے ذخیرے میں وہ الفاظ بھی شامل ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے تہذیبی ماحول میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔ ہندی کے مقابلے میں اُردو کی بنیاد کہیں زیادہ وسیع ہے اور اس کے مقابلے میں اُردو کا مشرب زیادہ آزاد اور فراخ ہے اور یہ سب اس لئے کہ اُردو نے دونوں فرقوں کے تمدن سے فیضان حاصل کیا ہے اور دونوں کی روایات پر ہاد ڈالا ہے۔

لوگ اُردو کے متعلق کچھ کہتے وقت (عموماً) یہ بھول جاتے ہیں کہ ہندوانی زندگی کا شاید ہی کوئی رخ اور پہلو ایسا ہو جسے اُردو زبان میں نہ پیش کیا گیا ہو۔ اردو میں اپنشدوں کے ترجمے موجود ہیں۔ بھاگوت گیتا کا ترجمہ ہو چکا ہے سمرتیوں، رامائن، مہابھارت، اور بہت سے پرانوں کے ترجمے ہمیں اُردو میں مل سکتے ہیں۔ ہندو مذہبیات اور فلسفۂ مذہب پر اُردو میں بڑی بڑی تصنیفیں موجود ہیں۔ جن میں ہندو دیومالا، ہندوؤں کی عبادتوں اور جاتراؤں وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ ہندو آرٹ اور خصوصاً موسیقی پر کثرت سے اُردو کتابیں موجود ہیں سنسکرت کے بہت سے ڈرامے، کہانیاں اور نظمیں اُردو ادب میں جگہ پا چکی ہیں۔ ہندوؤں کے علوم ریاضی، ہیئت و کیمیا وغیرہ کے تذکرے اُردو کتابوں میں ہیں۔ اور یہ سب کوئی تعجب کی بات نہیں اسلئے کہ انیسویں صدی کے آخر تک بہت سے ہندو اُردو کو خاص اپنی زبان مانتے تھے۔ ہندو شعرا اور نثر لکھنے والے اُردو کو اظہار خیال کا ذریعہ بناتے تھے اور شمالی ہند کے بہتیرے پڑھے لکھے ہندو، نہ صرف معلومات پڑھنے کی خاطر بلکہ ذوق سلیم کے تقاضے سے اُردو کتابیں پڑھتے تھے۔

ڈاکٹر تاراچند۔
~~~

مرزا جعفر علیخان صاحب. اثر

اڈون مارکہم کی نظم "دی مین وِتھ دی ہو" کا ترجمہ

"پیش لفظ" از مترجم

دل رانگ رانگ، سُدھ نہیں کچھ اپنے حال کی
تصویر اک "تھکے ہوئے" حزن و ملال کی
ہے صبح اسکی صبح، نہ شام اسکی شام ہے
اس بدنصیب شخص کا "مزدور" نام ہے

اثر

---

(۱)

صدیوں کے بوجھ سے ہے سر اسکا جھکا ہوا
اپنی کُدال کا ہے سہارا لئے ہوئے
افسردہ دل ہے، سوچ میں کھویا ہوا سا ہے
کیا سوچتا ہے؟ کیوں ہے زمیں کی طرف نظر
قرنوں کا "کھوکھلا" الم آنکھوں سے آشکار
جسپر زمانے بھر کے مصائب کا ہے، ہجوم
اپنی امید و یاس کا مرقد جو آپ ہے
جسکو خوشی سے کام، نہ حرماں کا امتیاز
بیتو را گیا ہو چوٹ کوئی کھا کے جس طرح
لادی کا بیل جیسے ہو، اللہ ری بے حسی!
یہ کس نے اسکے جبڑوں کا ڈھیلا کیا تناؤ؟
کیوں لط اُٹھ گیا ہے لبوں کا ہنسی کے ساتھ
یہ کس کے ہتکھنڈے ہیں کہ ماتھا پچک گیا؟
گل کر دیا چراغ خرد کسکی سانس نے

THE MAN WITH THE HOE

(Written after seeing the painting by Millet)

1. Bowed by the weight of centuries he leans
Upon his hoe and gazes on the ground,
The emptiness of ages in his face,
And on his back the burden of the world.
Who made him dead to rapture and despair,
A thing that grieves not and that never hopes,
Stolid and stunned, a brother to the ox?
Who loosened and let down this brutal jaw?
Whose was the hand that slanted back this brow?
Whose breath blew out the light within this brain?

2. Is this the Thing the Lord God made and gave
To have dominion over sea and land;
To trace the stars and search the heavens for power;
To feel the passion of Eternity?
Is this the dream He dreamed who shaped the suns
And markt their ways upon the ancient deep?
Down all the caverns of Hell to their last gulf
There is no shape more terrible than this—
More tongued with censure of the world's blind greed—
More filled with signs and portents for the soul—
More packt with danger to the universe.

3. What gulfs between him and the seraphim!
Slave of the wheel of labour, what to him
Are Plato and the swing of Pleiades?
What the long reaches of the peaks of song,
The rift of dawn, the reddening of the rose?
Through this dread shape the suffering ages look;
Time's tragedy is in that aching stoop;
Through this dread shape humanity betrayed,
Plundered, profaned, and disinherited,
Cries protest to the Powers that made the world.
A protest that is also prophecy.

4. O masters, lords and rulers in all lands,
Is this the handiwork you give to God,
This monstrous thing distorted and soul-quencht?
How will you ever straighten up this shape;
Touch it again with immortality;
Give back the upward looking and the light;
Rebuild in it the music and the dream;
Make right the immemorial infamies,
Perfidious wrongs, immedicable woes?

5. O masters, lords, and rulers in all lands,
How will the future reckon with this Man?
How answer his brute question in that hour
When whirlwinds of rebellion shake all shores?
~~How will it be with kingdoms and with kings—~~
With those who shaped him to the thing he is—
When this dumb Terror shall rise to judge the world,
After the silence of the centuries?

(۲)

کیا یہ وُہی بشر ہے خدا کو جو تھا عزیز؟
بھیجا تھا بحروبر پہ حکومت کے واسطے

تاروں سے راز چھیننے، افلاک سے وقار؟
طاقت کی انتہا تھی نہ کچھ دبدبے کی حد

ہر لمحہ جس کو مژدۂ عیشِ دوام تھا
جسکی بندھی تھی دھاک سمک سے سما تلک

سورج بنائے جس نے اور اُنکو رواں کیا
یہ اُسکا خواب ہے جسکے وہ دلچسپ خواب ہیں!

دوزخ کی ہولناک خلیجوں میں بھی نہیں
عفریت کوئی، اسکے جو لگ بھگ مہیب ہو

اہلِ جہاں کی اندھی ہوس کی "زبوں زباں"
مہلک نشانیوں کا "پلندہ" برائے روح

محدوش اسقدر ہو جو عالم کے واسطے
پیغام صد ہلاکت و بربادی و فساد

(۳)

محسود تھا فرشتوں کا اکدن یہی بشر
کتنا تباین اس میں، فرشتوں میں، آج ہے!

زنجیر میں غلامی کی جکڑا ہوا ہے یہ
محنت کی "رتھ" سے پاؤں ہے اسکا بندھا ہوا

کیا جانے یہ مبادئ تعلیم و فلسفہ
سمبندھ کیا ہے راگوں کا اور کیا الاپ ہے

پُوچھنا کسکو کہتے ہیں، کیا ہے سحر بس سحر
کس طرح سُرخ ہوتا ہے چہرہ گلاب کا

اس مسخ اور ڈراونے "راکش" کی آڑ سے
صدیاں اور اُنکے "تیرہ" مصائب میں جھانکتے

وہ کُبڑی پیٹھ اور وہ بھڑکی ہوئی رگیں
کیا کیا سلوک اس سے کئے ہیں زمانے نے

اس "پیکرِ درشت" پہ تکیہ کئے ہوئے
انسانیت حرارت سے محروم ہو گئی

اُن طاقتوں سے کرتی ہے فریاد منفصل
لائی ہیں جو وجود میں ایسے جہان کو

جس میں اڑایا جاتا ہے انساں کا مضحکہ
اور کچلے پیسے جانے کا ٹھہرا ہے مستحق

جسکو ڈھکیلیں قعرِ مذلّت میں، لُوٹ کر
. . . .

. . . .
مضمر اس احتجاج میں ہے پیشگوئی بھی !

(۴)

اے خواجگانِ خلق، خداوندگانِ دہر !
یہ تحفہ لے چلو ہو خدا کے حضور تم !

یہ بگڑی شکل جو ہے "عطشِ زار" جسم و روح !
تم اسکے غم نکالوگے کس طرح، کچھ بتاؤ

بخشوگے کسطرح اسے لا فانیت، کہو !
لافانیت، کہ حق تھا کبھی اسکی روح کا

آنکھوں کو اسکی دوگے چمک، قد کو راستی ؟
موسیقیت کا لوچ بھی اور خوشگوار خواب ؟

ہوگی تلافی کہنہ بداعمالیوں کی کچھ ؟
دھوکے دھڑی کی، رنج و مصیبت کی، جبر کی ؟

(۵)

اے خواجگانِ خلق و خداوندگانِ دہر !
کس طرح پیش پاؤگے، تدبیر سوچ لی !

کیا ہے جواب اس کے بہیمی سوال کا ؟
جب وقت انقلاب کی آئینگی آندھیاں

جب تہلکے میں ہونگے زمین و مکاں تمام
کیا حشر ہوگا مملکت و شہریار کا ؟

اُنکا، کہ ایسے "دیو" کے خلّاق جو ہوئے
اُس کے سپرد کرنے کو قسمت کا فیصلہ

"یہ گونگا قہر" اُٹھے گا جب احتساب کو
اک چیخ بنکے گونجیگی صدیوں کی خامشی !

غزل نظم

وہ کاشمیر وہ اسکی بہار، کیا کہنا
وہ تابناکیِ لیل و نہار، کیا کہنا

کیا ہے سنگ میں پیدا مزاج شیشے کا
بنائے جب ہیں ترے کوہسار، کیا کہنا

ہجوم یاسمن و لالہ و بنفشہ سے
زمیں ہے رنگ کا اک حشرزار، کیا کہنا

ہر ایک قطرے میں اک جوش ہے ترنم کا
بساطِ نغمہ ہے، یا جوئبار؟ کیا کہنا

نسیمِ صبح کی سرگوشیاں شگوفوں سے
چرا کے بوسہ یکایک فرار! کیا کہنا

مہک رہی ہے دلھن کی طرح کہیں نرگس
بہک رہا ہے کہیں آبشار، کیا کہنا

کبھی ہے چشمکِ گل میں پیامِ بیداری
کبھی وداعِ شکیب و قرار، کیا کہنا

چمن سے دور کھلے ہیں چمن سے باغی پھول
پسند آئے کھلے مرغزار، کیا کہنا

بجائے زرد کے ہر شاخ ارغوانی ہے
تری خزاں بھی ہے رشکِ بہار، کیا کہنا

تمام حسن کی دنیا، تمام کیف و سرور
زمانہ بھی ہو اگر میگسار، کیا کہنا

ربابِ شعر پہ گاتا ہوں گیت مستی کے
نہ میں ہوں رند، نہ میں بادہ خوار، کیا کہنا

اثرؔ کہ شاعری ابتک تھی جس کی محبوبہ
ہوا اداؤں کا تیری شکار، کیا کہنا

اثرؔ

رباعی

ہے پھول وہی جس پہ چمن نازاں ہو
ہے مشک وہی جس پہ ختن نازاں ہو
موتی ہے وہی جس پہ عدن نازاں ہو
انساں ہے وہی جس پہ وطن نازاں ہو

اثرؔ

ابوالاثر حفیظ جالندھری

بنجارہ پربت

(۱)

دو جانب تا حدِ نظر پھیلے ہوئے بن کے نظارے — کوہ و دمن کے سنگ و شجر کے دشت و چمن کے نظارے

اور دو جانب حور و قصور و خلد و عدن کے نظارے — یہ بنجارہ پربت - یہ فردوس دکن کے نظارے

جنت میں بھی کون کریگا ان سے زیادہ شاد مجھے

جنت میں کب ٹکنے دیگی اس دنیا کی یاد مجھے

(۲)

میں نے اس ویرانے کو بستی میں بدلتے دیکھا ہے — پتھر حسن صورت کے سانچے میں ڈھلتے دیکھا ہے

رنگ رنگ کی صنعت کا نیرنگ اچھلتے دیکھا ہے — سنگ سنگ پہ شاخ و شجر کو پھولتے پھلتے دیکھا ہے

اب [illegible] کی دنیا [illegible] یاد مجھے

جنت میں کب ٹکنے دیگی اس دنیا کی یاد مجھے

(۳)

پربت کی دیو زاد چٹانیں بنیادیں تعمیروں کی — قدرت جرأت دیکھ رہی ہے انسانی تدبیروں کی

صنعت منہ سے بول رہی ہے حاجت کیا تقریروں کی — خاموشی سے دیکھتے جاؤ دنیا ہے تصویروں کی

یہ مزدور نظر آتے ہیں مانی اور بہزاد مجھے

جنت میں کب ٹکنے دیگی اس دنیا کی یاد مجھے

(۴)

یاد مجھے تڑپائیگی ان باہمت انسانوں کی | جن کے حسنِ عمل سے بدلی ماہیت ویرانوں کی
جن کے قدم کی ٹھوکر سے جاگی تقدیر چٹانوں کی | جن کے ہاتھوں پتھر ٹوٹے شکل بنی ایوانوں کی

ان کی ندرت کاری پر دنیا ہے خراجِ داد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دیگی اس دنیا کی یاد مجھے

(۵)

صبح کمندیں پھینکتی ہے جب پست و بلند ہستی پر | پہلی کرنیں سورج کی لہراتی ہیں اس بستی پر
اس بستی کے حسن کا پرتو پڑتا ہے ہر پستی پر | لاکھوں مندر کھل جاتے ہیں چشم حسن پرستی پر

سجدوں پر اکساتی ہے ہر صبح نئی افتاد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دیگی اس دنیا کی یاد مجھے

(۶)

اس دنیا میں ذوقِ نظر پر وا ہے درِ آزادی کا | آزادی سے کرتا ہوں نظارہ اس آبادی کا
پس منظر کہسارِ مسلسل سامنے منظر وادی کا | شاید باغِ خاص یہی ہے فطرت کی شہزادی کا

جس میں نظر آتا ہے نہ گلچیں اور نہ کوئی صیاد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دیگی اس دنیا کی یاد مجھے

(۷)

مست ہوائیں پھولوں پر شبنم کے موتی رولتی ہیں | شاخوں کی آغوش میں ننھی کلیاں آنکھیں کھولتی ہیں
بلبل گل پر منڈلاتی ہے پیڑ پہ چڑیاں بولتی ہیں | میرے دل میں توبہ کی کمزور بنائیں ڈولتی ہیں

یاد آتے ہیں گشتِ مصلّٰی آب رکن آباد مجھے

جنت میں کب ٹکنے دیگی اس دنیا کی یاد مجھے

(۸)

زیر چرخ نیلی ساگر گہرے نیلے پانی کا
آنکھیں میں اور لطف تماشا لہروں کی جولانی کا

پہلی سی وہ کشتی دل ہے اور نہ جوش جوانی کا
موج ہوائے سیر میں لیکن عالم ہے طغیانی کا

گذرا ہوا طوفان ہے یہ آہنگ آئی یاد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دیگی اس دنیا کی یاد مجھے

(۹)

گو بحر ان ہر اس ساگر پر نور کا مینہ برساتی ہیں
اور ہوائیں آب رواں پر نقش و نگار بناتی ہیں

موجیں موج زنی کرتی ہیں اور لہریں لہراتی ہیں
نقرئی پریاں کھیلتی ہیں لڑتی ہیں پھر مل جاتی ہیں

ظالم چھیڑ لگاتی ہیں کہہ کہہ کر آدم زاد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دیگی اس دنیا کی یاد مجھے

(۱۰)

مغرب میں ہر شام یہاں ساقی کا دریچہ کھلتا ہے
رنگ شفق سیلاب کی صورت بام فلک سے ڈھلتا ہے

نیلم کے ہر ساگر میں یاقوت کا جوہر گھلتا ہے
کس کو خبر یہ خوننابہ کس شے سے بنتا جلتا ہے

ہائے یہی شے ہے یہی شے ہے جس نے کیا برباد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دیگی اس دنیا کی یاد مجھے

(۱۱)

دن کا مسافر کرتا ہے جب فکر آسودہ ہونے کی
پچھم میں ہوتی ہے نمائش اک رنگین بچھونے کی

سورج دیوتا ٹھانتے ہیں زرّیں محل میں عزّت کی | پیر فلک کو سوجھتی ہے اک کھیت میں موتی بونے کی

محو حیرت کرتی ہے یہ دولت لاتعداد مجھے
جنّت میں کب ٹکنے دیگی اس دنیا کی یاد مجھے

۱۲

جس دم نیند کی ماتی دنیا بستر پر جا سوتی ہے | قمقمہ ہائے برق سے برپا بزم چراغاں ہوتی ہے
پریم کی دیوی جل مندر میں چندر ہار پروتی ہے | اسکی آنکھیں جل مندر میں میرا آنسو موتی ہے

ہر موتی کی جوت پہ دیوی کہتی ہے دے ضیا دمجھے
جنّت میں کب ٹکنے دیگی اس دنیا کی یاد مجھے

(۱۳)

پینٹھ میں جیسے بنج باجری سینت بکھارے کرتے ہیں | بات بات میں گھاتی جیسے خفیہ اشارے کرتے ہیں
ایسی ہی کچھ جلوہ فروشی چاند ستارے کرتے ہیں | رات رات میں لاکھوں ہی کے وارے نیارے کرتے ہیں

کیا کیا رنگ دکھاتی ہے یہ دنیائے شب زاد مجھے
جنّت میں کب ٹکنے دیگی اس دنیا کی یاد مجھے

(۱۴)

ہاں یہ میرے دن ہیں پیارے ہاں یہ میری راتیں ہیں | بن ہول در مری آنکھوں کی بھیدبن میں شرارتیں ہیں
چاند ہے سورج ہے سبزہ ہے بادل ہے برساتیں ہیں | تنہائی ہے خاموشی ہے دل کی دل سے باتیں ہیں

حاصل ہے اس دنیا میں تخییل سخن ایجاد مجھے
جنّت میں کب ٹکنے دیگی اس دنیا کی یاد مجھے

غیر مطبوعہ — خاص برائے پرتاپ

حضرت رَوشؔ صدیقی

کوثرِ کشمیر

(ڈل سے خطاب)

(۱)

نگارِ نازِ صنم خانۂ جمال ہے تو
عروسِ مسند کاشانۂ وصال ہے تو
غرورِ جنتِ رعنائیِ خیال ہے تو
فنا پذیر ترا جلوۂ جمیل نہیں
تو ایک خوابِ بقا آفریں ہے جھیل نہیں

(۲)

ترے حضور فلک ہے نیاز آمادہ
بچھے ہوئے مہ و خورشید ہیں سرِ جادہ
کہیں سحاب، کہیں ہے بہارِ افتادہ
رواں ہے زمزمۂ آبشار تیرے لئے
جھکا ہوا ہے سرِ کوہسار تیرے لئے

(۳)

صباحتیں ترے انوار کی تماشائی

لطافتوں کو ملی تجھ سے جلوہ آرائی
ہر اک ادا ہے تری کائنات رعنائی
زفرق تا بقدم حسن نازنیں تو ہے
مرے حسین تصوّر سے بھی حسیں تو ہے

(۴)

نگارِ صبح نے الٹا نقاب تیرے لئے
عروس شام ہوئی بے حجاب تیرے لئے
ہے فرش راہ شب ماہتاب تیرے لئے
عزیق نور ہے عکس ضیا اساس ترا
دروغ مہ سے ہے اترا ہوا لباس ترا

(۵)

رخ صبح پہ وہ غازہ شفق افشاں
تن لطیف کی زینت، قمیص آب رواں
ردائے سبز کے گوشوں میں لالہ وریحاں
کنول بہ نہیں یہ تری اوڑھنی کے جھالر ہیں
ٹکے ہوئے ترے آنچل میں لعل و گوہر ہیں

(۶)

کہیں طلسم رواں ہے خرام ناز ترا!

کہیں بہشت نشاں ہے خرام ناز ترا!
متاعِ نازِ جہاں ہے خرام ناز ترا!
وہ کاشمیر جسے ارجمند تو نے کیا
اُسے بہشت سے بھی سربلند تو نے کیا

(۷)

وہ تیرا بلبلِ مخمور سے گلے ملنا
اُس اپنے شاہدِ مغرور سے گلے ملنا
بہ اشتیاق بہت دُور سے گلے ملنا
کچھ اضطراب کا عالم کچھ انبساط کا رنگ
مژہ پہ اشک، جبیں پر نشاط کا رنگ

(۸)

ادھر وہ چشمۂ شاہی، پیامِ نظارہ
ادھر نشاط، وُہ رنگینیوں کا گہوارہ
نسیم، آہ وُہ حوروں کا خوابِ آوارہ
ذرا قریب سے وہ شالمار کا منظر
زمین پر مہ و انجم کے پیار کا منظر

(۹)

وہ سبز پوش جزیرے کسی نگیں کی طرح

بیاضِ نور پہ نقشِ زمرّدیں کی طرح
حسین طشت میں گلدستۂ حسیں کی طرح
شمیم جس کی بہاروں کو کھینچ لاتی ہے
کبھی فلک کے ستاروں کو کھینچ لاتی ہے

(۱۰)

کہیں ہے بزمِ چنار و صنوبر و شمشاد!
کہیں ہے میکدۂ گلرخانِ آتش زاد!
کہیں ہے انجمنِ مہ وشانِ پاک نہاد!
لگی ہے کشتیٔ عشرت ترے کنارے سے
بہت قریب ہے جنّت ترے کنارے سے

(۱۱)

کہیں بلند ہے خیموں سے آتشِ نغمات
کہیں رواں ہے شکاروں میں کاروانِ حیات
سپردِ عشرتِ طوفاں ہے کشتیٔ جذبات
ہجومِ عیش و مسرّت میں جب نہ راہ ملی
سکوں کو تیرے آغوش میں پناہ ملی

(۱۲)

وہ شامِ کفر ادا، ساقیٔ شراب و گلاب

وہ خوش خرام شکارے وہ جادۂ مہتاب
رواں وہ قافلۂ نور جانبِ مہتاب
وہ چپوؤں کی صدا وہ پیامِ خاموشی
وہ زیر و بم وہ شکستِ نظامِ خاموشی

(۱۳)

عروسِ شام شکاروں کے ساتھ ساتھ رواں
مہِ تمام شکاروں کے ساتھ ساتھ رواں
بہت پیام شکاروں کے ساتھ ساتھ رواں
نمودِ شوق بجز حیرتِ خموش نہیں
کہیں بھی تمکنتِ آرزو کو ہوش نہیں

(۱۴)

ترے جمال کو شرح و بیاں کی تاب کہاں
ترے جلال کو چشمِ جہاں کی تاب کہاں
تجھے کسی نگہہِ راز داں کی تاب کہاں
یہ لطف بھی مگر اے دلنواز تونے کیا
کہ مجھکو خود ہی شناسائے راز تونے کیا

(۱۵)

ترا سرور، نقابِ خمار تشنہ لبی

ترے سکوں سے عیاں حسرتِ سکوں طلبی
تری جبیں سے ہے روشن، گدازِ نیم شبی
ہے دل میں داغِ محبت لئے ہوئے تو بھی
یہ جامِ نورِ بقا ہے پئے ہوئے تو بھی

(۱۶)

وہ تیری اک شبِ زرّ بار یاد ہے مجھکو
وہ عالمِ سحر آثار یاد ہے مجھکو
وہ منزلِ دلِ بیدار یاد ہے مجھکو
سنا رہا ہے تخیّل وہ داستاں اب بھی
گذر رہا ہے نظر سے وہ کارواں اب بھی

(۱۷)

وہ چاندنی میں نہایا ہوا جہانِ دگر
وہ رنگ و بو میں بسایا ہوا جہانِ دگر
وہ کائنات پہ چھایا ہوا جہانِ دگر
خمیدہ نغمہ سرِ تبخانۂ وجود کہیں
تصورات کو بھی حسرتِ سجود کہیں

(۱۸)

کہیں ضیائے خراماں اسیرِ نظارہ

کہیں طلسم نشاں، کہکشاں کا فوارہ
سرور و کیف کا وُہ کارواں آوارہ
فضا میں مستیٔ مستور چھائی جاتی تھی
نسیم عمرِ رواں لڑکھڑائی جاتی تھی

(۱۹)

بکھر گئے تھے بہشت و اِرم کے خواب کہیں
سرک گیا تھا رُخِ حُسن سے نقاب کہیں
نگاہِ شوق تھی خود سر بر حجاب کہیں
وہ رات تھی کہ کوئی خلد کا فسانہ تھا
ہر ایک گوشۂ تنہا نگار خانہ تھا

(۲۰)

ہجوم شوق میں وُہ دلنوازِ تنہائی!
نصیبِ دیدۂ بیدار خوابِ رعنائی!
وہ سر خوشی وہ غمِ زندگی کی رسوائی!
وہ کیا سکوں تھا کہ جس میں کچھ اضطراب نہ تھا
نشاطِ زیست کے رُخ پر کوئی حجاب نہ تھا

(۲۱)

دریچوں کے جھروکے سے جھانکتا تھا کوئی

حیاتِ درد کو تسکین دے رہا تھا کوئی
حریمِ دل سے بہت پاس آ گیا تھا کوئی
وہ کیف بے خبری آہ وہ نسیم وصال
بسی ہوئی تھی ہر اک سانس میں شمیم وصال

(۲۲)

قریب و دور وہ نغماتِ عود و چنگ و رباب
رواں ہو جیسے کوئی کاروانِ عالم خواب
کسی نے کھول دئے تھے نشاطِ روح کے باب
اتر رہا تھا کوئی قافلہ حسینوں کا
ورود سوئے زمیں تھا ارم نشینوں کا

(۲۳)

وہ دامنِ شبِ زرّیں وہ مسندِ آرام!
مرا شکارہ انجم نما تھا مستِ خرام!
پہونچ رہے تھے ہواؤں کے مشکبو پیغام!
عجب تلاطمِ عشرت بپا تھا سینے میں
رواں ہو جیسے کوئی خلد کے سفینے میں

(۲۴)

جمالِ حسرتِ روپوش روبرو پیہم

بہشتِ تمکنتِ ہوش رو برو ہیں ہم
ہزار جنّتِ خاموش رو برو ہیں ہم
وہ خامشی وہ تقاضائے شادمانیٔ دل
وہ خامشی جسے حاصل تھی ترجمانیٔ دل

(۲۵)

مسرتوں کے وہ سیلاب صبح ہونے تک
سیاحتِ شبِ ماہتاب صبح ہونے تک
فروغِ انجمنِ خواب صبح ہونے تک
تمام رات وہ راز و نیاز کی باتیں
تمام رات کسی دلنواز کی باتیں

(۲۶)

وہ شمع خلوتِ دل میں ابھی فروزاں ہے
وہ خواب اب بھی مری بیخودی کا عنواں ہے
وہ رات اب بھی مری روح میں درخشاں ہے
حیات نقشِ وفا کو مٹا نہیں سکتی
فنا چراغِ تصوّر بجھا نہیں سکتی

خواجہ عبدالسمیع پال اثرؔ صہبائی

دُعا

آگاہ مری رُوح کو اسرار سے کر دے!
جویائے حقیقت ہوں حقیقت کی خبر دے!

جو دیکھ سکے شوکت باطل کی حقیقت
یارب تو مجھے اپنے کرم سے وُہ نظر دے!

دُھل جائے مری رُوح کی آلُودگی جس سے
یارب مجھے وہ اشکِ شب و آہ سحر دے!

جسمیں ہو چمک صدق و صفا مہر و وفا کی
یارب میری سیرت کو وہ تابندہ گہر دے!

کر دے جو فنا خرمنِ باطل کو جلا کر
یارب مرے نغموں کو وہ بے باک شرر دے!

غم ہو کہ خوشی جادۂ حق سے نہ ہٹوں میں
یارب وہ بصیرت وہ عزیمت وہ جگر دے!

آیا ہوں ترے میکدۂ جود و سخا میں
یارب مئے عرفاں سے مرے جام کو بھر دے!

غیر مطبوعہ — خاص برائے پرتاپ

جناب خضر تمیمی

ہاتھ کی روانی

یہ ہے آج ہی رات کی داستاں — کہ تھے میہماں میرے اک مہرباں
غرض بیاہ نہ کھانے کو وہ دیکھ کر — ہوئے صورتِ باز، کچھ تیز پر
مجھے ٹالنا اُن کا دشوار ہے — کہ دُرِّ نظر کا یہ اصرار ہے
دکھاؤں میں حضرت کے کھانیکا ڈھنگ — لکھوں اُن کے لقمے اڑانے کا رنگ
مگر کس طرح ماجرا یہ لکھوں — کہوں بھی تو یہ بات کیونکر کہوں
قلم کانپتا ہے وہ آہی نہ جائیں — اور ہڈی سمجھ کر چبا ہی نہ جائیں
زباں بند بتیس دانتوں میں ہے — کہ پھر شور کچھ اُنکی آنتوں میں ہے
جو تھیں دقتیں کہہ چکا برملا — غرض دیکھئے ہاتھ اُن کا چلا
پلیٹوں میں ہلچل مچاتا ہوا — وہ چمچے پہ چمچا بجاتا ہوا
پلاؤ میں سالن ملاتا ہوا — وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہوا
وہ بوٹی پہ چڑھ کر لپٹتا ہوا — وہ روٹی سے بڑھکر جھپٹتا ہوا
فقط شوربے سے کھسکتا ہوا — مربّے سے جاکر چپکتا ہوا
وہ مرچوں سے دامن بچاتا ہوا — گیا دال پر دندناتا ہوا
وہ چمچے سے چُلّو بناتا ہوا — وہ آلو کو اُلو بناتا ہوا
جلیبی پہ یاں پیچ کھاتا ہوا — ہتھیلی دہی پر کھبتا ہوا

پسند اس پسندے کو کرتا ہوا — تو چٹنی پہ چٹخارے بھرتا ہوا
پلاؤ پہ پہل پہل کے آتا ہوا — وہ پھرنی[۲] پہ پھر پھر کے آتا ہوا
یہ برفی کا دل سرد کرتا ہوا — وہ زردے کا منہ زرد کرتا ہوا
نوالے سے کشتی بناتا ہوا — وہ حلوے کے گولے بناتا ہوا
اور اس منہ میں انکو گراتا ہوا — جو ہے غار پر زہر کھاتا ہوا
وہ کھلتا ہوا اور وہ مڑتا ہوا — وہ ہلتا ہوا اور وہ جڑتا ہوا
وہ جبڑوں میں بوٹی مسلتا ہوا — لئے بن چبائے نگلتا ہوا
وہ کلوں سے ٹیلے بناتا ہوا — اور آنکھوں کو پیچھے چھپاتا ہوا
لپکتا، لٹکتا، لپٹتا ادھر — سسکتا، سرکتا، سمٹتا ادھر
لبوں پر زباں کو پھراتا ہوا — وہ نمازی ہے یوں کھانا کھاتا ہوا
سمجھ کر مرے گھر کو جائے وغا — "نہ ہلا نہ ٹلا نہ جنبید زجا"
غرض اس طرح ہیں مرے مہرباں — انیس اب دیکھ لیں شاعر نکتہ داں

وہ سودے وہ اکبر کا آب لوڈور
یہاں خضر کی بے زبانی کا زور

---

۱ شاعر کی ننھی بچی کا نام۔

۲ اصل لفظ فرنی ہے۔ شاعر نے دانستہ تصرف کیا ہے

ڈاکٹر تاثیر

فرار

محاورہ مابین شاعر و ضمیرِ فطرت

مجھے حاصل ہیں دنیا کے مراتب، مال و دولت بھی
گوارا میری سیرت ہے، گوارا میری صورت بھی
میسّر ہے خمارِ عشرت و کیفِ محبّت بھی
تو پھر یہ مُردنی کیوں چھا رہی ہے میری دُنیا پر

تجھے حاصل ہے سب کچھ پھر بھی غم بے حاصلی کا ہے
یہ غم تیرا بجا ہے یہ ترا احساس سچّا ہے
کہ جیتا جاگتا ہے تو کہ تیرا قلب زندہ ہے
مگر اک مُردنی چھائی ہوئی ہے تیری دُنیا پر

میں گھُل مل جاؤں گا یوں خاکساروں بینواؤں میں
بدل ڈالوں گا سب احکام اپنے التجاؤں میں
میں اپنا مال و دولت بانٹ ڈالوں گا گداؤں میں
کرے گا طعن کوئی کس طرح پھر میری دُنیا پر

غریبوں کی غریبی کیا مٹے گی ان نواؤں سے
نپٹ سکتا نہیں تو اس طرح سرمائے والوں سے۔

الگ بالکل ہے تیرا مسئلہ ان سب سوالوں سے
کہ تیری اپنی دُنیا طعنہ زن ہے تیری دُنیا پر

کروں گا اپنا گھر آباد میں اک اور دُنیا میں
کنارِ آبِ رُکنا باد و گلگشتِ مصلّیٰ[1] میں
کسی برباد بستی میں، کہیں آزاد صحرا میں
نہ ہوگا پھر کسی کا بھی تسلّط میری دُنیا پر

جہاں بھی جائیگا تو تیری دُنیا ساتھ جائے گی
نہ چھوڑے گی کبھی تجھ کو یہ تنہا، ساتھ جائے گی
یہی حسرت، یہی تیری تمنّا ساتھ جائے گی
رہے گا تیری دُنیا کا تسلّط تیری دُنیا پر

میں دُنیا چھوڑ دوں گا، میں خدا سے لَو لگاؤں گا
صنم خانوں کے ایوانوں میں قندیلیں جلاؤں گا
کلیساؤں کے محرابوں میں اپنا سر جھکاؤں گا
خدا کے عرش کا سایہ رہے گا میری دُنیا پر

تو چاہے بھی تو پرچھائیں سے دل بہلا نہیں سکتا
خدا کا نور بھی آنکھیں تری چندھیا نہیں سکتا
جسے تو سچ سمجھتا ہے اُسے جھٹلا نہیں سکتا
اندھیرا ہی اندھیرا چھا رہا ہے تیری دُنیا پر

[1] حافظ۔

میری ظلمت کو چمکائے گی طلعت مہ جبینوں کی
حصارِ عافیت بن جائیں گی باہیں سیینوں کی
غموں کو محو کر دے گی مسرت ہم نشینوں کی
خوشی سے پھول برسیں گے ہمیشہ میری دُنیا پر

"تمناؤں میں اُلجھاتا" رہے گا دل کو تو کب تک
"کھلونے دے کے بہلاتا" رہے گا دل کو تو کب تک
خلافِ عقل منواتا رہے گا دل کو تو کب تک
ہوس کی ظلمتیں چھائی ہوئی ہیں تیری دُنیا پر

نرالی ہے زمانے سے مرے افکار کی دُنیا
حسینوں سے حسیں تر ہے مرے اشعار کی دُنیا
شبِ مہتاب کی دُنیا، مہِ رخسار کی دُنیا
یہی انوار نکہت بار ہوں گے میری دُنیا پر

چھپا رکھے گا خوابوں میں کہاں تک تو حقیقت کو
دبا رکھے گا لفظوں میں کہاں تک تو صداقت کو
یہ پردے اور بے پردہ کریں گے تیری فطرت کو
تری فطرت رہے گی سایہ افگن تیری دُنیا پر

تو میں تیغ و کفن باندھے ہوئے کودوں گا میداں میں
حیاتِ جاوداں پنہاں ہے آبِ تیغِ براں میں

ملے شاد عظیم آبادی

بہار آجائے شاید اس طرح میرے گلستاں میں
خزاں چھائی ہوئی ہے مدتوں سے میری دُنیا پر

بہار آئی نہ ہو جس باغ میں اُس کی خزاں کیسی
ترا جینا بھی مرنا ہے حیاتِ جاوداں کیسی
یہ تلواریں کہاں کی ہیں یہ تیر کش کیا، کماں کیسی
ابد کی موت طاری ہو چکی ہے تیری دُنیا پر

نہ جینے کی ہوس باقی نہ مرنے کا خطر دل میں
بھٹکتے پھرتے ہیں رہرو غبارِ راہ منزل میں
ابھی لیلائے مستقبل چھپی بیٹھی ہے محمل میں
ابھی کچھ دیر تاریکی رہے گی ساری دنیا پر

مجو اے لالہ از کس غمگساری
بہ سوز تن نوا از درون جوش یاری
بہار یادوں کہ ہم پیر سینہ چاکی
نگہدار ایں کہن داغے کہ داری
اقبال

(ارمغان حجاز)

پرفیسر لال طالب

ظہورِ کرشن

ابھی ہنگامہ تھا خوابیدہ دورِ ہستی کا
ابھی نقاشہ دنیا کا رنگِ رخ پھیکا

حریم قدس کا ابتک باب تھا خاموش
ابھی تصورِ عابد سکوں سے تھا ہمدوش

نگاہِ دل میں ابھی شوقِ دید تھا مستور
ابھی نہ راز کا محرم تھا عاشقِ مہجور

حجابِ وہم کا حائل تھا عجز بالی میں
جواب تھا ارنی کا لن ترانی میں

ہوئی تھی سرے سے کائنات کی تعمیر
کہ سوزِ جذبِ محبت کی بڑھ گئی تاثیر

صفائے قلب سے اک آہ عرش تک پہنچی
صدا الست و بلیٰ کی فضا میں گونج اٹھی

بہارِ رحمتِ حق خوب جوش میں آئی
فدائے جلوہ ہوئے دہر کے تماشائی

نفوذ کر گیا ان میں تجلیات کا جوش
ادا کے مارے ہوئے آج ہو گئے مدہوش

نظر فریب دلاویز خوش ادائی سے
ظہورِ ذاتِ الٰہی کے جم گئے نقشے

شہود و غیب کا آپس میں اتصال ہوا
زمانہ موردِ اکرام ذوالجلال ہوا

سمایا ذرے میں اک آفتاب عالمگیر
قریب دور ہر اک کی چمک اٹھی تقدیر

بشر کا پردۂ پندار تار تار ہوا
خودی کے راز کا مطلب خود آشکار ہوا

جمال و عشق کے سربستہ راز فاش ہوئے
دوئی کے جتنے تھے پردے وہ پاش پاش ہوئے

ضیائے حسنِ مجسم سے پردہ در ہو کر
صفات و ذات کو رنگِ مجاز میں کھو کر

جمالِ تام کے جلوے کا انتشار ہوا
جہاں کی خاک کا ہر ذرہ نور بار ہوا

قیام کے یہ بعد انتخاب ہوا
شرف ملا اسے جو رشکِ آفتاب ہوا

اُستاد کی بدحالی

آجکل ہے صیدِ آلام و محن اُستاد بھی
حالِ جور و جفا اتنا نہ تھا فرہاد بھی

ایک دن وہ تھا کہ اُسکی شان تھی دنیا شکار
ایک دن یہ ہے نہیں سُنتا کوئی فریاد بھی

باعثِ نظم و ترقی اب بھی ہے اس کا وجود
اسکے دم سے ہے شگفتہ گلشنِ ایجاد بھی۔

ذات میں اسکی ہے مضمر رازِ اوجِ ملک کا
زندہ ہیں اقوام اس سے مستفید افراد بھی

اس کے دامن میں پلے ہیں کتنے ہی اربابِ فن
اس کے ہیں مرہونِ منّت صاحبِ ایجاد بھی

اس نے پیدا کر دئے بی۔اے اور ایم۔اے بیشمار
اس کے دم سے بڑھ گئی اجداد سے اولاد بھی

یہ شفا بخشِ مریضانِ سقیم الحال ہے
خونِ سودائے جہالت کے لئے فصّاد بھی

اس کے آگے کرتے ہیں تہ سب ہی زانوئے ادب
رندِ مے آشام، پنڈت، واعظ و زہّاد بھی

اس کے زورِ علم و فن سے آج ہوتے ہیں فنا
مفلسی۔ بے چارگی۔ رنج و غم افتاد بھی

فیضیاب آج اسکی صحبت سے ہیں سارے خاص و عام
آنکھ والے اور نابینائے مادر زاد بھی

اسکی ہمدردی میں ہے ماں کی محبت کا ظہور
شفقتِ پدری سے خوش ہے خاطرِ ناشاد بھی

لیکن اب اس مخزنِ تہذیب کی حالت نہ پوچھ
تختۂ مشقِ ستم ہے موردِ بیداد بھی

رحم آتا ہے مجھے حالت پر اسکی آجکل
کس مپرسی میں بھی ہے یہ اور ہے ناشاد بھی

اپنی بدحالی سے ہے بیچارہ اک تصویرِ یاس
اس کے حالِ زار سے مغموم ہیں حسّاد بھی

کام اصلی ہو تو کوئی داد تک دیتا نہیں
ہو قصور ادنیٰ تو ہے مقہور بھی برباد بھی

پاسِ خودداری کے باعث اس قدر مجبور ہے
ہو نہیں سکتا کسی سے طالبِ امداد بھی

اسکی دلجوئی کے ساماں آپ ہیں اپنی نظیر — غور سے سُننے کے لائق اسکی ہے رُوداد بھی
تاکہ ہو سیر و سیاحت عمر بھر اس کو نصیب — بے سبب پاتا ہے تبدیلی کے یہ ارشاد بھی
منبع علم و ادب ہوتے ہوئے قانع رہے — اسلئے ہوتا نہیں تنخواہ میں ایزاد بھی
نعمت انعام سے محروم رہجائے نہ یہ — طعن اور تشنیع کے ملتے ہیں کچھ اسناد بھی
مدتوں ہوتا نہیں اس کا کوئی پرسان حال — تا نہ ہو پابند قید خارج معیاد بھی
لے نہیں سکتا ہے ٹیوشن بلا اجازت اسلئے — تا بنے خود سر نہ یہ غم سے نہ ہو آزاد بھی

اس پہ بھی شکوہ نہیں کرتا مگر کہتا ہے یہ
"سب گوارا ہے اگر سنتے رہو فریاد بھی" — طالب

رنگِ تغزل

آجا نشاطِ گلکدۂ دل لئے ہوئے — برسات اور بہار کا حاصل لئے ہوئے
زخموں میں جاگزیں خلش جاوداں ہوئی — دل ہے خیالِ دوست کا حاصل لئے ہوئے
ناحق ہے مرنے والوں کو جینے کی آرزو — ہیں حق شناس جذبۂ باطل لئے ہوئے
چھائی ہوئی ہے کیوں مری محفل پہ مردنی — اُٹھا ہے کون رونقِ محفل لئے ہوئے
سر بار دوش دل تب غم سے ہے سر گراں — آسانیاں ہیں عقدۂ مشکل لئے ہوئے
ہے اہلِ دل کی ظرف شناسی کا شکریہ — آیا ہوں آج کاسۂ سائل لئے ہوئے

پتھر کا ہے مقابلہ شیشے سے اے جمیل
اک دل ہوں میں بھی دل کے مقابل لئے ہوئے — (بشیر احمد جمیل متعلم ایف اے)

[illegible] ۲۰۰/[illegible]

قفس

انگریزی نظم (Cage) کا ترجمہ

حیف وہ عہدِ جوانی جبکہ تھا میں بے بصر
جب قفس کی تیلیاں طیار خود کرتا تھا میں
خوشنما تاروں کی رونق سے سدا خائف تھا میں
حسن کو سمجھا گناہوں کیطرح تھا نیشتر

حسن کے انجام کو سمجھا ہوا تھا دلخراش
اور قفس کو اک حصار عافیت سمجھا تھا میں
ایک کونے میں دبک کر کاٹتا تھا زندگی
زندگی سے بھاگنے کو زندگی سمجھا تھا میں

پر پھڑکتا ہوں قفس میں تیلیاں ہیں خندہ زن
ختم ہے زورِ جوانی ہے قفس کو بھی خبر
ہائے کھلنا قفلِ زنگ آلود کا ممکن نہیں
زندگی یوں بیدلی سے کسطرح ہوگی بسر

الحذر

انگریزی نظم (Caged) سے متاثر ہو کر

خدا ہی رحم کرے حالِ زار پر اُسکے
وہ شخص جس نے محبّت کبھی نہیں ہے کی
چراغ حُسن سے روشن نہ تیرہ شب جسکی
امورِ دنیا میں جسکی ہوئی ہو عمر تباہ
جہانِ عشق کی گم ہو گئی ہو جس سے راہ
وہ جس کے خواب بھی ناآشنائے حسن رہے
تصورات بھی جس کے رہینِ کار رہے
سکونِ قلب پہ اپنے جو ناز کرتا رہا
حسین چہروں سے اپنی نظر بچاتا رہا
امنڈ کے آنسو نہیں آئے جسکی آنکھوں میں
دھڑکتا دل نہیں رکھتا جو اپنے پہلو میں
وہ جس نے رات کی بے خوابیاں نہیں دیکھیں
اور انتظار کی بے تابیاں نہیں دیکھیں

مرزا کمال الدین صاحب شیداؔ

"ملکۂ کہسار"

کوہساروں سے جو اتراتی ہوئی آتی ہوں میں
جنگلوں میں بستیوں میں ناچتی گاتی ہوں میں

کوہ زادی ہوں مرے ہیں پاسبان چیل و چنار
مہ جبین ہوں "ملکۂ کہسار" کہلاتی ہوں میں

آکے برفانی پہاڑوں سے برہنہ سیم تن
شرم کے مارے پگل کر آب ہوجاتی ہوں میں

میرے پہلو میں نہاں ہے اک دل پر اضطراب
اسکو اک گہوارۂ سنگین میں بہلاتی ہوں میں

دل ہی دلمیں اک خلش سی کرتی ہوں محسوس جب
سنگریزوں سے برابر سر کو ٹکراتی ہوں میں

ہے میری افتادگی میں سربلندی کا مقام
اوڑھ کر اک پردۂ فوارہ اتراتی ہوں میں

آبشاروں میں نغمہ ریزی ہے مری فردوس گوش
جبکہ دہقاں زادیوں کی لوریاں گاتی ہوں میں

میرے زیر و بم کا ہے گاؤں میں ہنگامہ بلند
بستیوں میں جا کے پھر خاموش ہوجاتی ہوں میں

آ رہی ہوں آبشاروں کا لئے ساز و رباب
اپنے نغموں سے ہر اک محفل کو گرماتی ہوں میں

چومتی ہے ہر کلی رخسار میرے ناز سے
سبزۂ خوابیدہ سے جھک کر لپٹ جاتی ہوں میں

اک تسلسل پیچ و خم کا زندگانی ہے مری
مست ناگن کی طرح دن رات بل کھاتی ہوں میں

اسجگہ اے ملکۂ ہندوستان (نورجہاں)
تیری صحبت یاد آتی ہے تو گھبراتی ہوں میں

کوہ سے دامن بچا کر دشت پیمائی کے بعد
جھیل ڈل کے بیکراں پانی سے ملجاتی ہوں میں

جاڑیوں میں سے گذر کر کشتِ دہقاں سینچکر
باغ آصف[1] سے اچھل کر ڈل میں کھو جاتی ہوں میں

[1] نشاط باغ سے مراد ہے

سید غلام حسین بیتاب

آبشار سے

اے ہمالہ کی پری، سیماب پا، اے آبشار   تیری رقصاں موج کی رعنائیوں پر میں نثار
ناچتی ہے دامنِ کوہسار میں گاتی ہے تو   عالمِ کون و مکاں کو وجد میں لاتی ہے تو
مست ہیں تیری ادائیں لرزشیں جانانہ ہیں   تیری موجیں کیف آور رشکِ صد میخانہ ہیں
کیا کسی کافر ادا کی ململی آنچل ہے تو   یا جوانی کا تلاطم خیز دریائے نمو

تیری ہر جنبش ہے اے رقاصہ پیغامِ حیات
ہے فدا تیری اداؤں پر یہ ساری کائنات

ہر گھڑی بیتاب ہے تو بلکہ آتش زیر پا   ہے عیاں نغموں سے تیرے سازِ فطرت کی صدا
نغمۂ سحر آفریں سے سب سحر خاموش ہیں   مست ہیں، سرشار ہیں، مسرور ہیں۔ مدہوش ہیں
رشکِ سازِ خلد ہے سوز آفریں نغمہ ترا   لحنِ داؤدی سے بڑھکر ہے کہیں تیری صدا
نغمۂ کیف آفریں پیدا ہے تیرے ناز میں   زندگی کی موج پنہاں دامنِ کہسار میں

"تیرے ان دھیمے سروں کی گود میں سو جاؤں میں
خواب کی دنیا کے ویرانوں میں گم ہو جاؤں میں"

تو کسی دوشیزۂ مہ پارہ کا گہوارہ ہے   آسماں کا یا کوئی ٹوٹا ہوا سیارہ ہے
تو سراپا نور ہے ہاں وادیٔ ایمن ہے تو   جلوہ گر ہیں جلوہ ہائے طور تیرے روبرو
تو سراسر ہے بلاشک ترجمانِ حسن و عشق   تو ازل سے ہے امین و رازدانِ حسن و عشق
کارفرما جلوۂ مخفی ترے پردوں میں ہے   تجھ سے سوزِ عشق زندہ گنبدِ گردوں میں ہے

فاش میگویم کہ ما و ہوئے ایں جز راز نیست
نغمۂ بے منتِ مضرابِ او زیں ساز نیست

عرشی

ابو ظفر کاشمیری

سنہ لوکک اور کشمیری سنہ

لوکک سمت کو سپت رشی سمت بھی کہتے ہیں ۔ اور چونکہ اس کی ابتدا کشمیر سے ہوئی ہے ۔ اسلئے اس کو کشمیری سمت بھی کہا جاتا ہے ۔ گو پونچھ اور کشتواڑ آج بھی کشمیر کے ماتحت ہیں ۔ لیکن چمبہ اور کانگڑہ کے بعض علاقے بھی کسی زمانے میں کشمیر ہی کے زیر اقتدار تھے ۔ اسلئے اس سمت کا رواج کشمیر کے علاوہ ان علاقوں میں بھی تھا ۔ اور کہا جاتا ہے کہ ان علاقوں کے بعض برہمنوں میں آج بھی یہ سمت رائج ہے ۔

جب ۱۳۲۰ء میں یہاں مسلمان حکمران ہوئے ۔ تو انہوں نے لوکک سمت کی بجائے ایک اور کشمیری سنہ ایجاد کیا جس کا ذکر آگے آئیگا ۔

لوکک سنہ کی ابتدا اس کے بانیوں اور موجدوں نے چیت شدی اکیم سمت ۲۵ کلجگ سے رکھی ہے ۔ یا بہ الفاظ دیگر یہ سمت ۳۰۷۶ سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے ۔ کشمیر کے تمام سنسکرت مؤرخوں اور مصنفوں نے اپنی تصنیفات میں اسی سمت کو رواج دیا ہے ۔ پنڈت کلہن نے جس سال اپنی مشہور تاریخ راج ترنگی تصنیف کی اس سال لوکک سمت ۴۲۲۵ تھا ۔ اور عیسوی سنہ اسکے مطابق ۱۱۵۰ء تھا ۔ اب ان ایام میں جبکہ یہ مضمون لکھا جا رہا ہے ۔ لوکک سمت ۵۰۱۷ ہے ۔ اور اسکے مطابق عیسوی سنہ ۱۹۴۱ و ۱۹۴۲ ہے ۔

پنڈت کلہن کے تاریخی سلسلہ کو قایم رکھنے کے لئے جونراج مؤرخ نے بعہد بڈشاہ بادشاہ کشمیر ۴۵۳۵ لوکک مطابق ۱۴۵۹ء میں دوسری راج ترنگی لکھی جس کا نام اس نے راجاولی یا زینہ ترنگی رکھا ۔ اسیطرح جونراج کے بعد اس کے شاگرد پنڈت شریور نے جونراج کے سلسلہ کو قایم رکھتے ہوئے ۴۵۶۲ لوکک مطابق ۱۴۸۶ء میں تیسری راج ترنگی بنام زینہ راج ترنگی قلمبند کی ۔ اپنی تاریخوں میں جونراج اور شریور نے کشمیری مسلمان بادشاہوں کے جو سالہائے تخت نشینی لوکک سمت کے مطابق درج کئے ہیں ۔ ان میں سے چند ایک ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ۔

نام بادشاہ	تخت نشینی مطابق لوکک سمت	مطابق سنہ ہجری	مطابق سنہ عیسوی
رینچن شاہ عرف ملک صدرالدین	۴۳۹۶	۷۲۰ھ	۱۳۲۰ء
شمس الدین شاہ میری	۴۴۱۵	۷۴۰ "	۱۳۳۹ "
سلطان شہاب الدین	۴۴۳۰	۷۵۵ "	۱۳۵۴ "
سلطان سکندر شاہ	۴۴۶۵	۷۹۱ "	۱۳۸۹ "
علی شاہ	۴۴۸۹	۸۱۶ "	۱۴۱۳ "
بڈشاہ	۴۴۹۶	۸۲۳ "	۱۴۲۰ "
حیدر شاہ	۴۵۴۶	۸۷۴ "	۱۴۷۰ "
حسن شاہ	۴۵۴۸	۸۷۶ "	۱۴۷۲ "
محمد شاہ بار اوّل	۴۵۶۰	۸۸۹ "	۱۴۸۴ "

لوکک سنین کے ساتھ جو ہجری اور عیسوی سنین لکھے گئے ہیں وہ راقم السطور نے لوکک سنین کے مطابق کا حساب لگا کر خود درج کئے ہیں۔ اور ان کی تصدیق ذیل کی سطور سے ہو سکتی ہے۔

طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ میں علی شاہ بادشاہ کشمیر کی گرفتاری کا سال جمادی الاول ۸۲۳ھ درج ہے اور اسی سال اس کا بھائی بڈشاہ تخت نشین ہوتا ہے ۸۲۳ھ کے مطابق لوکک سال ۴۴۹۶ ہے جونراج اور شری ور نے بھی ۴۴۹۶ لوکک ہی کو بڈشاہ کی تخت نشینی کا سال لکھا ہے۔ کشمیر کے مابعد مؤرخوں نے بڈشاہ کی حکومت کا سال اوّل جو ۸۲۶ھ لکھا ہے وہ غلط ہے۔

بڈشاہ کے فرزند سلطان حیدر شاہ کا ایک سکہ جو عجایب گھر سرینگر[1] میں موجود ہے ۸۷۴ھ کا ہے اس سکہ کے ایک طرف "السلطان الاعظم حیدر شاہ" اور دوسری طرف "ضرب کشمیر فی شہور سنہ سبعین" ساتھ ۸۷۴ھ کے اعداد درج ہیں۔ فارسی مؤرخوں نے بڈشاہ کا سال وفات ۸۷۹ھ لکھا ہے۔ جو اس سکہ کی رُو سے قطعاً غلط ہے۔ اگر فارسی مؤرخین کے قول کے مطابق بڈشاہ کا سال وفات ۸۷۹ھ صحیح سمجھا جائے تو اس کے فرزند کا سکہ اسکی موت سے پانچ سال قبل ہی کس طرح کشمیر میں رائج ہوسکتا ہے۔ لوکک سنہ

[1] عجایب گھر میں گذشتہ ہندو اور مسلمان والیان کشمیر کے جو سکے موجود ہیں اُن کے فوٹو ز کتاب "ہینڈ بک آف آرکیولوجیکل اینڈ نیومس میٹک" میں طبع ہو چکے ہیں۔ اس سکہ کا فوٹو صفحہ ۱۴۴ پر اور اس سکہ کی کیفیت کتاب ہذا کے ۱۵۹ صفحہ پر درج ہے۔

۴۵۴۶ کی مطابقت ہجری سنہ ۸۰۴ کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور شرلور نے بھی لوکک سنہ حیدر شاہ کی تخت نشینی کا لکھا ہے۔

مزارکلاں یعنی احاطۂ قبرستان شیخ بہاء الدین گنج بخشؒ میں ایک پختہ قبر سعید خان کی ہے۔ اس پر کچھ عبارت سنسکرت اور فارسی میں درج ہے۔ قبر کے کتبہ پر فارسی عبارت میں لکھا ہے "بہ سال ہشت صد و ہفتاد و نو شہادت یافت"۔ یعنی ۸۷۹ھ سعید خان کا سال شہادت درج ہے۔ سنسکرت عبارت میں صرف ۶۰ لوکک اور بعہد محمد شاہ کے الفاظ درج ہیں۔ ساٹھ لوکک سے مراد ۴۵۶۰ لوکک ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ۸۸۹ھ میں محمد شاہ تخت نشین ہو چکا تھا۔ مسلمان مورخوں نے محمد شاہ کا سال تخت نشینی جو ۸۹۳ھ لکھا ہے وہ غلط ہے۔

"بہارستان شاہی" میں سلطان سکندر کی وفات ۸۱۶ھ درج ہے۔ اور اس سنہ کے مطابق لوکک سنہ ۴۴۹۶ ہوتا ہے۔ اور یہ لوکک سال ۸۱۶ھ کے مطابق ہے۔ غرض جو نراج اور شرلور نے جو لوکک سال درج کئے ہیں وہ صحیح ہیں اور ان لوکک سالوں کے مطابق جو ہجری سنین قاعدہ کے رو سے نکلتے ہوں وہ درست سمجھے چاہئیں۔

سلطان شمس الدین شہمیری بانی سلطنت شہمیریہ (۱۳۲۹ء) نے کشمیر کا لوکک سنہ جو تین ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے سے کشمیر میں رائج تھا۔ ترک کر کے اس کی بجائے کشمیری سمت کے نام سے ایک نیا سنہ جاری کیا۔ جس کی ابتدا اس نے ۱۳۲۰ء سے رکھی جبکہ تبتی شہزادہ رینچن شاہ نے اسلام قبول کر کے کشمیر میں اسلامی حکومت کی بنا رکھی تھی۔

شاہمیر نے سال کے دنوں کا شمار ۳۶۵ کی بجائے قمری سال کے مطابق ۳۵۴ دنوں پر رکھا مہینوں کے نام ہندی اور کشمیری دونوں زبانوں میں رکھے گئے۔ چونکہ قمری اور شمسی سال میں گیارہ دن کا فرق رہتا تھا۔ اسلئے مہینوں کو موسم کے مطابق رکھنے کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ ہر تیسرے سال میں ایک مہینہ زائد رکھا جانے لگا۔ جس سے کشمیری سال کا توازن تین سال کے بعد شمسی سال کے برابر ہو جاتا تھا۔

قمری مہینوں کے نام ہندوستان میں عرب سے آئے ہیں نہایت قدیم زمانہ جاہلیت میں عرب کے ہاں مہینوں کے نام یہ تھے۔ موتمر۔ ناجر۔ خوان۔ صوان۔ زبا۔ بائد۔ اصم۔ واغل۔ ناطل۔ عادل اہل عرب کے ہاں سال بارہ مہینے اور ۳۵۴ دنوں کا ہوتا تھا۔ یعنی قمری اور شمسی سال کے درمیان گیارہ دن کا فرق تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کبھی کوئی مہینہ جاڑوں میں آ جاتا تھا کبھی گرمیوں میں۔ جب بعد کو ہر تیسرے

سال لوند کا ایک مہینہ بڑھایا جانے لگا۔ تو اسوقت گرمی سردی زمانۂ بارش اور اوقات کاشت وغیرہ کے لحاظ سے مہینوں کے جدید نام رکھے گئے۔ جو حسب ذیل ہیں۔ محرم۔ صفر۔ ربیع الاول۔ ربیع الآخر۔ جمادی الاولیٰ۔ جمادی الآخر۔ رجب۔ شعبان۔ رمضان۔ شوال۔ ذوالقعدہ۔ ذوالحجہ۔ ہر مہینہ کے نام کی کوئی نہ کوئی وجہ تسمیہ بھی ہے۔

معلوم ہوتا ہے شمس الدین شہمیری یا تو خود قمری مہینوں کو موسموں کے مطابق کرنے کی ضرورت سے آگاہ تھا یا اس کے پاس کوئی ایسا واقف کار آدمی موجود تھا۔ جو مہینوں کے متعلق اہل عرب کے رواج سے واقف تھا اسلئے اہل عرب نے جو طریقہ مہینوں کو موسموں کے مطابق بنانے کے لئے اختیار کیا۔ اور جس طریق سے انہوں نے گیارہ یوم کا فرق ہر تیسرے سال کے بعد نکالا۔ وہی طریق شمس الدین نے بھی کشمیر میں اختیار کیا۔

اب کشمیر میں کشمیری سنہ یا سمت کا رواج تو نہیں ہے۔ البتہ کشمیری مہینوں کا رواج دیہات میں بعض زمینداروں کی بول چال میں پایا جاتا ہے۔ کشمیری سمت سنہ ۱۳۲۰ء سے اگر اب تک جاری رہتا۔ تو آج (سنہ ۱۹۴۱ء سنہ ۱۹۴۲ء) میں اسکو ۶۲۲ سال کا عرصہ گذر جاتا۔

کشمیری سلمان بادشاہوں کے زمانہ میں جوں جوں فارسی کا زیادہ رواج ہوتا گیا۔ کشمیری سمت کے ساتھ ہی سنہ ہجری بھی رائج ہوتا گیا۔ کشمیری سمت چک بادشاہوں کے زمانہ تک جاری رہا۔ ان ایام میں جو کتابیں مسلمان کشمیری مصنف لکھتے تھے۔ ان پر سال تصنیف کشمیری سمت کے ساتھ بالعموم ہجری سنہ بھی ہوتا تھا۔ لیکن پنڈت مصنفوں کے کشمیری سمت کا بہت کم استعمال کیا ہے انہوں نے یا تو لوکک سمت استعمال کیا ہے یا ہندی بکرمی اور ہجری۔

کشمیری سنہ شہمیری بادشاہوں کے زمانہ میں قبروں کے تعویذوں اور مختلف کتبوں پر بھی درج ہوتا تھا۔ جیسا کہ مندر شنکر اچاریہ کی مرمت (بعہد سلطان حسن شاہ) کا سال "پنجاہ و چہارم" درج ہے چونکہ پنجاہ و چہارم کے ساتھ ۱۵۴ یا ۱۰۵۴ یا اور کوئی ہندسہ درج نہیں ہے اسلئے بعض اسکو لوکک کہتے ہیں بعض کشمیری اور بعض ہجری۔ مصنف تاریخ حسن نے تو صاف لکھدیا ہے "کہ سلطان زین العابدین در ۸۴۷ھ چہار ستون سنگین و تا یہ سقف آن استوار نمود۔ پھر آگے لکھا ہے "چنانچہ بر یک ستون دو سطر منقوش است"

سطر اوّل۔ این ستون برداشت خواجہ اکم بن مرجان سال پنجاہ و چہار کشمیری۔

سطر دوم۔ معمار این ستون را۔ دوامی بہشتی زرگر سال پنجاہ و چہار۔

بڈشاہی عہد کے مصنف اور بعد کے قریب العہد مؤرخ اس بارہ میں قطعی خاموش ہیں۔ اس لئے اب ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ کیا درحقیقت بڈشاہ کے عہد میں مندر شنکراچاریہ کی مرمت ہوئی تھی۔

سنہ ۸۷۴ھ بڈشاہ کا سال وفات ہے۔ اسی سال بقول تاریخ حسن مندر کے چہار ستون سنگین معہ سقف استوار ہوتے ہیں۔ اور ہر ستون کی عبارت میں سطر اول سے پنجاہ وچہار کشمیری اور دوسری سطر سے صرف پنجاہ و چہار کے الفاظ ظاہر ہوتے ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کشمیری سمت جب سنہ ۷۲۰ھ سے شروع ہوتا ہے۔ تو سنہ ۸۷۴ھ میں جب یہ ستون معہ سقف تیار ہوجاتے ہیں کس منزل پر تھا۔ ۸۷۴ سے ۷۲۰ وضع کرنے پر باقی ہمیں ۱۵۴ احاصل ہوتے ہیں۔ اب مندر کے ستون پر ۵۴ درج ہے اور یہاں ۱۵۴ نکلتے ہیں۔ اس کا حل اسطرح ہوسکتا ہے۔ کہ نہ صرف اہل کشمیر بلکہ ہر ملک کے لوگ بالعموم سنہ اور تاریخ لکھنے کے وقت احاد لکھتے ہیں اور سالات ساقط کردیتے ہیں۔ چنانچہ سمت بکرمی سنہ ۱۹۹۹ ہے لیکن عموماً تحریروں میں صرف ۹۹ ہی لکھا جاتا ہے۔ اسیطرح عیسوی سنہ ۱۹۴۲ ہے مگر تحریروں میں صرف ۴۲ ہی لکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح اس زمانہ میں بھی احاد لکھنے کا دستور تھا۔ اور ۱۵۴ کی بجائے ۵۴ ہی لکھ دیا کرتے تھے۔ گویا پنجاہ وچہار سال سے مراد صرف ۵۴ نہیں بلکہ ۱۵۴ ہے۔ جو نہ لوکک ہے نہ ہجری نہ بکرمی بلکہ کشمیری سمت ہے۔

سنہ ۸۷۴ھ مطابق کشمیری سمت ۱۵۴ میں بڈشاہ انتقال کرجاتا ہے۔ اور یہی سال شنکراچاریہ کے مندر کی مرمت کا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرمت سنہ ۸۷۳ھ یا اوائل سنہ ۸۷۴ھ میں شروع ہوچکی تھی۔ اور چونکہ وہ مرمت کچھ بہت زیادہ نہ تھی اسلئے اس سال اس کی موت سے پیشتر ہی ختم ہوچکی تھی۔

اسی طرح مزار سلاطین میں ایک پختہ قبر دروازہ کے قریب ہی ہے۔ صاحب قبر کا نام اڑ گیا ہے صرف یہ الفاظ پڑھے جاتے ہیں" بہ سال شصت وشش از حساب کشمیری۔ کہ ہشتم صدی ذی الحجہ المبارک بہ ہجری یہاں ہشتم صدی ہجری کے ساتھ سمت کشمیری ۶۶ بھی درج ہے۔ یہ زمانہ سلطان قطب الدین شہمیری کا تھا۔

کشمیری مہینوں کے نام حسب ذیل ہیں۔ وہیک۔ جیٹھ۔ ہار۔ شراون۔ بادرت۔ آشت۔ کارتک۔ منجہور۔ پوہ۔ ماگ۔ پھاگن۔ چیتر۔ کشمیری سال کا پہلا دن یعنی کشمیریوں کا نوروز ماہ وہیک کی یکم کو مقرر کیا گیا۔ جو پھاگن سمت بکری تین تاریخ کو ہوتا ہے۔

محمد عبداللہ قریشی

کشمیر ۱۸۴۶ء میں

جب جنگِ سبراؤں ختم ہوگئی اور انگریزوں نے سکھ فوج کو شکست دیکر انکی جتھہ بندی کو منتشر کر دیا۔ تو لاہور دربار کو ایک عہد نامہ پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ اس عہدنامہ کی چند بڑی بڑی شرائط یہ تھیں کہ "سکھ دربار بیاس اور ستلج کے درمیان کا علاقہ چھوڑ دے گا۔ اور ڈیڑھ کروڑ روپیہ بطور تاوانِ جنگ ادا کرے گا۔ اگر دربار یہ تمام رقم ادا نہ کر سکے گا یا تسلی بخش ضمانت نہ دے گا تو کشمیر اور ہزارہ کے علاقے بھی انگریزوں کے حوالے کر دیگا۔ اور معاہدہ کی تصدیق سے قبل یا بعد پچاس لاکھ روپیہ ادا کیا جاویگا۔ سکھ فوج میں تخفیف کر کے کل پچیس بٹالین پیدل اور بارہ ہزارہ جوان رسالہ کے رکھے جائیں گے اور جس قدر توپیں سرکاری فوجوں کے مقابلے میں لائی گئی تھیں وہ سب سرکار کو دے دی جائیں گی"[1]

چونکہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے اس لڑائی میں انگریزوں کے خلاف کوئی عملی قدم نہ اٹھایا تھا۔ بلکہ سکھوں کو انگریزوں سے صلح کرنے کی ترغیب دینے میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ اس لئے اس کی خدمات کے پیش نظر اس عہد نامہ میں ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی تھی کہ مہاراجہ گلاب سنگھ ان علاقوں کا خود مختار فرمانروا سمجھا جائیگا۔ جو اسکو تفویض ہوں گے۔

۱۰ر فروری ۱۸۴۶ء کو یہ عہد نامہ مکمل ہوا۔ اور اس تاریخی دستاویز پر لعل سنگھ۔ بھائی رام سنگھ تیج سنگھ اور دیوان دینا ناتھ نے دستخط کئے۔ مگر دربار تاوانِ جنگ کی رقم ادا نہ کر سکا جسکی بنا پر کشمیر وغیرہ کا علاقہ بھی اس سے لے لیا گیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک عہد نامہ سرکار انگریزی اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان مرتب ہوا جسکی رو سے دریائے سندھ کے مشرق اور دریائے راوی کے مغرب کا تمام علاقہ ہمیشہ کے واسطے اسے دے دیا گیا۔ اور اس سے ۷۵ لاکھ روپیہ جو دربار لاہور نہ دے سکا تھا لے لیا گیا

[1] کارنامۂ لارڈ ہارڈنگ۔

کشمیر جیسے زرخیز اور زر ریز علاقہ کو مہاراجہ گلاب سنگھ والی جموں کے حوالے کرنے کی پالیسی پر لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل کے خلاف بہت کچھ لے دے کی گئی۔ مگر انہوں نے ایک خط میں اپنے ایک نزدیکی رشتہ دار کو ذیل کی وجوہ لکھیں:-

"پچھلے ماہ مارچ میں یہ ضروری معلوم ہوا کہ سکھوں سے کشمیر لے کر انکو کمزور کر دیا جائے کشمیر سے ستلج کا فاصلہ تین سو میل ہے۔ راستہ بالکل پہاڑی اور دشوار گذار ہے اور چھ ماہ تک بالکل بند رہتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص انگریزی فوج تین سو میل کے فاصلے پر رکھتا۔ جہاں سے امداد کا پہنچنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ تو وہ لارڈ کے خطاب کا نہیں بلکہ پاگل کے خطاب کا مستحق ہوتا"

(کارنامہ لارڈ ہارڈنگ ص۱۷۱)

اسوقت دربار لاہور کی طرف سے شیخ امام الدین کشمیر کا گورنر تھا۔ اُس نے لال سنگھ وغیرہ مشیر کی مہاراجہ گلاب سنگھ کو کشمیر کا قبضہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر انگریزوں کی طرف سے آٹھ رجمنٹیں دیسی پیدل فوج کی معہ بارہ توپوں کے بریگیڈیر وہیلر صاحب کے زیر کمان فوراً روانہ کشمیر کی گئیں۔ شیخ امام الدین کے پاس کل آٹھ نو ہزار کی جمعیت تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ انگریزی فوج کی تاب لاسکتا تھا۔ اُس نے جب سُنا کہ سرکاری فوجیں چڑھائی کر رہی ہیں۔ اور عنقریب درّہ کشمیر میں داخل ہونے والی ہیں۔ تو وہ بہت ڈرا اور مقابلہ کا خیال چھوڑ کر متابعت کی نیت سے خود لاہور چلا آیا۔ اور اُس نے وہ راز افشا کئے جو لال سنگھ کے زوال کا باعث ہوئے اور جن کی بنا پر اسے عہد نامہ لاہور کی شرائط سے انحراف کے الزام میں سرکاری عملداری میں جلاوطن کر دیا گیا۔ جہاں وہ گمنامی کی موت مر گیا۔ اور اس طرح کشمیر کی بغاوت کا خاتمہ ہو گیا۔

جب عہد نامہ لاہور کے مطابق کشمیر مہاراجہ گلاب سنگھ کے قبضے میں چلا گیا۔ تو ۱۸۴۶ء کے موسم بہار میں لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل خود تو چند ماہ آرام کرنے کے لئے شملہ چلے گئے۔ مگر ان کے خلف الرشید و پرائیویٹ سکرٹری چارلس والی کونٹ ہارڈنگ نے کشمیر کی حسین وادی کی سیاحت کا فیصلہ کیا [illegible] الفنسٹن صاحب جو بعد میں بمبئی کے گورنر ہوئے۔ کپتان نکلسن صاحب۔ کپتان اے ہارڈنگ۔ ڈاکٹر لواکر اور میجر بٹس وغیرہ چند عہدہ دار بھی انکے ہمراہ تھے۔ انکا اپنا بیان ہے کہ وہ نجی طور پر سیر کرنے گئے تھے کسی قسم کا سفارتی کام انکے سپرد نہ تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ ہر چیز کا اچھی طرح جائزہ

لیتے گئے تھے۔ اور انہوں نے اسکی رپورٹ بھی سرکار کو کردی تھی۔

ہوشیارپور اور پٹھانکوٹ کے راستے دلکش سفر کرنے کے بعد ۱۳ اپریل کو یہ قافلہ جموں پہنچا۔ جہاں مہاراجہ گلاب سنگھ نے بہ نفس نفیس توپ کے اس پار جاکر شاندار خیر مقدم کیا۔ کارنامہ لارڈ ہارڈنگ میں مذکور رہے۔

"کشمیر جاتے وقت ہم نے راجہ گلاب سنگھ سے بھی انکے پہاڑی قلعہ جموں میں ملاقات کی۔ راجہ مذکور نے ہماری ازحد خاطر تواضع و مدارات کی۔ اسمیں کچھ شک نہیں۔ کہ اس خاطر تواضع کی ایک خاص غرض تھی۔ جسوقت ہم گلاب سنگھ کے سامنے گئے تو آداب و ملحوظات ملاقات کے متعلق ایک دقت پیش آئی۔ نکلسن صاحب جو بعد میں اپنی حسن خدمات اور کارنمایاں سے بہت ممتاز ہوئے۔ اس وقت ہمارے ترجمان اور مراسم آداب کے لئے ہمارے سربراہ معتمد رہے۔ انکی رائے تھی کہ ہم بوٹ اتار کر راجہ کی ملاقات کو جائیں چونکہ ہم پوری وردیاں پہنے ہوئے تھے ہم نے لارڈ الفنسٹن کے ساتھ مشورہ کرکے بالاتفاق قرار دیا کہ ہم ایک ایسے شخص کے خوش کرنے کے لئے جس کو تمام اقتدار اور اعزاز ہماری ہی بدولت ملا تھا۔ اپنے آپ کو بیوقوف نہ بنائینگے۔ نکلسن صاحب اپنی رائے پر قائم رہے۔ اور جب ہم راجہ گلاب سنگھ کے پاس گئے۔ نکلسن صاحب پوری وردی پہنے ہوئے تھے۔ باہر آکر ہم نے انکی اس حرکت پر انکو خوب طعنے دئیے۔"

(ص ۱۸۵ - ۱۸۴)

مہاراجہ صاحب کے ساتھ ان کی ملاقات نہایت دلچسپ تھی۔ رسمی گفتگو کے بعد مہاراجہ صاحب نے انکو اپنے تمام معرکوں کا حال سنایا اور ایک بڑی سی تصویر دکھائی جو کسی دیسی مصور کی بنائی ہوئی تھی اور جس میں انکی زندگی کے تمام واقعات کا مرقع تھا۔

ایک ہفتہ جموں میں قیام کرکے یہ قافلہ کشمیر روانہ ہوا۔ راستہ نہایت دشوار گزار تھا پہاڑی خچروں کے سوا کسی دوسری سواری کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس پر بھی سواروں کو بار بار اپنی خچروں سے نیچے اترنا اور بھربھرے پتھروں کی بڑی بڑی عظیم الشان ابھری ہوئی چٹانوں پر چلنا پڑتا تھا۔ جن کے نیچے بڑی بڑی گہری کھڈیں تھیں۔ کئی جگہ راستہ اتنا تنگ تھا کہ مسافروں کو ہاتھوں اور پیروں پر رینگ کر گزرنا پڑتا تھا۔

گرتے پڑتے اور ٹھوکریں کھاتے یہ لوگ کشمیر پہنچے۔ جہاں وہ دس روز ٹھہرے اور مشہور

مقامات کی سیر کر کے کشتواڑ۔ کانگڑہ۔ منڈی اور بلاس پور کی راہ سے واپس آ گئے۔ شیخ امام الدین گورنر کشمیر نے انہیں ڈل کی سیر کرائی قلعہ ہری پربت دکھایا۔ ان کے شکار کھیلنے کے لئے جماعتیں مقرر کیں۔ اور انکے زمانہ قیام کو نہایت خوشگوار اور مسرت بخش بنانے کے لئے جو انتظام ہو سکتا تھا کیا۔

اسکے بعد سب ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہو گئے۔ اور چارلس ہارڈنگ صاحب ڈاکٹر واکر کو ہمراہ لیکر گورنر جنرل کے پاس شملہ چلے گئے۔

اس مختصر سے سفر میں جو کچھ دیکھا گیا۔ راستے میں جو کچھ سننے میں آیا اور کشمیر میں جن جن لوگوں سے ملاقات ہوئی اس کا ایک نہایت سچا سچا بیان گنیش لعل میر منشی نے ایک چھوٹی سی قلمی کتاب میں جو فارسی زبان میں ہے۔ قلمبند کیا ہے۔ یہ کتاب "کشمیر نما" کے نام سے مشہور ہے کتاب کے مصنف نے جو بہت ہی فہیم تھا۔ وہاں کے لوگوں کی تمدنی معاشرتی۔ اقتصادی اور سیاسی حالت کا صحیح صحیح نقشہ کھینچنے کے علاوہ ریاست کی صنعت و حرفت پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے۔

امید کی کشتی

ناامیدی کے تند دھارے پر — اپنی تقدیر کے سہارے پر
تیز موجوں میں ڈگمگاتی ہوئی — خوف طوفاں سے تھرتھراتی ہوئی

بہہ رہی ہے امید کی کشتی

یاس و حرماں کے چھائے ہیں بادل — غرق کرنے کو آئے ہیں بادل
کوئی تدبیر چل نہیں سکتی — یعنی تقدیر ٹل نہیں سکتی
ڈوب مرنے کا کچھ ملال نہیں — پار اُترنے کا بھی خیال نہیں
کاش! ساحل تو دیکھ لیتا میں — اپنی منزل تو دیکھ لیتا میں
تند موجوں نے گھیر کر آخر — سارے دریا میں پھیر کر آخر
دام گرداب میں پھنسا ہی دیا — موت کا راستہ دکھا ہی دیا
آہ! دریا میں غرق ہوتی ہے — یاس امید کو ڈبوتی ہے

میرے اللہ مجھے بچا لینا
پنجۂ موت سے چھڑا لینا

باقی صدیقی

(ماخوذ)

پروفیسر مفتی جلال الدین

ایک گمنام شاعر کے کلام کا نمونہ

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے جناب میاں گل محمد المعروف میاں کنگال صاحب نے کشمیر کو بھی آغوش تربیت میں لیا۔ اس بزرگ ہستی کے سلسلۂ طالبان و مریداں میں سے کشمیر کے ایک تاریک اور اسوقت کی تہذیب و تعلیم کی روشنی سے دُور پڑے ہوئے علاقہ میں آج سے ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصہ پہلے دنیا کی دو اہم زبانوں یعنی عربی و فارسی کا ایک بہت بڑا شاعر پیدا ہوا۔ اس گمنام شاعر کے حالات زندگی پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ جو کچھ تحقیقات سے دستیاب ہوگا پرتاپ کی آئندہ اشاعتوں میں پیش کیا جائے گا۔ اس شاعر کا نام مولوی حمید اللہ بن مولوی حمایت اللہ ہے۔ موجودہ اشاعت میں وقت کی دیری کی وجہ سے اُن کے عربی و فارسی اشعار کا صرف ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

جناب میاں کنگال صاحب علیہ الرحمۃ نے پنجابی زبان میں حروف ہجا کی ترتیب پر وعظ و نصیحت میں اخلاقی صُوفیانہ اشعار لکھے ہیں۔ ہمارے اس دیہاتی شاعر نے اپنے اس پیر و مرشد کے ایک ایک شعر کا آزاد ترجمہ عربی اور فارسی اشعار میں کیا ہے۔ ان میں سے یہاں حروف الف اور یا کے اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

حرف الالف

(۱) (پنجابی) الف آو کدا ہین تان سمجھی نہین جیہڑا دم گیا کدی آ لوڑ دائی۔

(عربی) الف بالنفس الفیہاء وقط ÷ فلم تسمع کلامی من مقالات
مضٰی ما من نفوس العمر فی الدہر ÷ فلم تاتی الیک ذاک ہیہات

(نوٹ) راقم کے پاس کتاب کا جو نسخہ ہے اُس میں لم تاتی دیا ہوا ہے۔ عربی صرف و نحو کے قواعد کے رُو سے لم تأت ہونا چاہیئے۔

(فارسی) الف آی ای نفس از جائے شنیدستے بگو ہر نفس کاں رفت از عمر تو باز آید دگر

(ترجمہ) اے نفس (اے میری جان) کہو کیا تم نے کہیں سنا ہے کہ تمہاری عمر میں سے جو سانس جاتا ہے وہ واپس بھی آتا ہے۔

(نوٹ) اس شعر میں لفظ نفس میں ایک لفظی صنعت پیدا کی گئی ہے۔ ایک نَفْس ہے اور دوسرا نَفَس۔ پہلے نفس

انسانی کو خطاب کیا گیا ہے۔

(۲) (پنجابی) اس دم دا کجھ وساہ ناہی — ای نال پلک پلک گھاٹا کھا لو دائی

(عربی) لھذالنفس لا یعبأ بنھم — فلا تحصی لھا فی الاعتبارات
یقلل کل نفس طرفة العین — وینقص کل حرف من عبارات

(فارسی) ایں نفس را اعتمادے نیست زیرا کایں نفس — دمبدم نقصاں پذیر د تا رسد عمرت بسر

(ترجمہ) اس زندگی کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ اس میں سے ہر لحظہ ایک ایک سانس کم ہو جاتا ہے یہانتک کہ تمہاری عمر اسی طرح ختم ہو جاتی ہے۔

(۳) (پنجابی) تینوں عقل نہ فکر کجھ ہوش ناہی — تیندا وقت ویلا جیوڑا لو دائی

(عربی) فلا عقل لا الفھم ولا الفکر — لک یا نفس ضاعت (عنک) اوقات

(فارسی) عقل و فکر و ہوش کو اے نفس وقت میرود — سیف قاطع وقت دال ہر دم غنیمت بشمرد

(ترجمہ) تیرے پاس نہ عقل ہے نہ ہوش نہ تو فکر رکھتا ہے۔ تیرا وقت ضایع ہوتا جاتا ہے تو وقت کو ایک تیز تلوار (الوقت سیف قاطع۔ فرمودہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ) جان لے اور ایک ایک لمحہ کو غنیمت سمجھ لے۔

(۴) (پنجابی) کنگال غافل نوں تاں خبر ناہیں — آخر اوڑک سبھی پچھوں تا لوں دائی

(عربی) لا نفر غفلة من فوت حین — فیندم آخرا و یصیب عبرات

(فارسی) وقت شد از دست زیں کنگال غافل بیخبر — میشود آخر پشیماں میبرد داغ جگر

(ترجمہ) اس مفلس کے ہاتھ سے وقت (جاتا رہتا ہے) اور وہ خود اس سے (فوت حین) غافل و بیخبر ہے۔ آخر پشیمان ہو جائیگا اور جگر پر داغ لے جائیگا (اس مصیبت میں آنسو بہائیگا۔ عربی)

حرف الباء

(۱) (پنجابی) ب بہت نہیں سدا جیوناں نہیں — اس جیو نے تہیں تہ دھوئے ہے

(عربی) ولبائ لا بقاء فی الحیوة — فغسل الید عنھا من لزومات

(فارسی) ب بسی مارا بنا شد زیستن زیں زندگی — دست شو ہر دم ز دیدہ اشک ریز اے جان من

(ترجمہ) ہمیں اس زندگی میں (اس دنیا میں) زیادہ دیر زندہ نہیں رہنا ہے (اس زندگی کو کوئی بقا نہیں۔ عربی) ہاتھ دھولے اے میرے پیارے اور آنکھوں سے آنسو بہائے بس ...

سے ہاتھ دھونا ضروریات میں سے ہے - عربی)

(۲) (پنجابی) گئی عمر نہیں آوناں ہے — گئی رہی دے ماں بھر دیئے جے

(عربی) ولا یرجع الینا فائت العمر — ففی الماضی و (نی) الباقی حزونات

(فارسی) عمر رفتہ باز نایدما بقی ہم رفتہ داں — گریہ کن بر رفتہ و آئندہ نیز اے جانِ من

(ترجمہ) گئی ہوئی عمر واپس نہیں آتی ہے اور جو حصہ باقی رہا ہے اسکو بھی رفتنی سمجھ لے اے میری جان
گئے گذرے ہوئے وقت اور آنے والے وقت یعنی ماضی اور مستقبل پر جو مبہم ہیں خوب رونا چاہیئے

(۳) (پنجابی) بھلا ذکر تے فکر یار دا نین — ہور صفت ثنا میں تان کھوئیے جے

(عربی) وفکر ثم ذکر اوّل العشق — تحمد لازم فی کل اوقات

(فارسی) بہتری در ذکر و فکر یار تحمید و ثنا است — از زبان و دل بیا زایں چار چیز اے جانِ من

(ترجمہ) تمہاری بھلائی دوست کے ذکر و فکر اور حمد و ثنا میں ہے۔ اے میری جان۔ دل اور زبان سے
یہ چار ادا کر دے۔

(۴) (پنجابی) کنگال خودی ہستی چھوڑ دیجئے — دائم غرق نیستی میں تان ہوئیے جے

(عربی) لا فقر ترک اعزاز و عجب — وغرق فی بحار البحر حسنات

(فارسی) از خودی کنگال بگذر غرق بحر نیستی — باش دائم تا ازاں باشی عزیز اے جانِ من

(ترجمہ) اے کنگال خودی سے گذر جا اور ہمیشہ نیستی کے سمندر میں غرق رہ - تا کہ تم عزیز جہاں ہو۔

رُباعی

تکمیل بشر نہیں ہے سلطاں ہونا — یا صف میں فرشتوں کی نمایاں ہونا

تکمیل ہے عجز بندگی کا احساس — انسان کی معراج ہے انساں ہونا

فانی

کشمیر جہانگیر کی نظر میں

کشمیر کا طول بھولباس کی گھاٹی سے پنچھے تک چھپن کوس جہانگیری ہے اور عرض ستائیس کوس سے زیادہ اور دس سے کم نہیں۔ شیخ ابوالفضل نے اکبرنامے میں تخمینے اور قیاس لکھا ہے۔ کہ ملک کشمیر کا طول دریائے کشن گنگا سے پنچھے تک ایک سو بیس کوس ہے اور عرض دس سے کم اور پچیس سے زیادہ نہیں۔ ہم نے اپنے اطمینان کے لئے معتمد اور کاردان اشخاص کی ایک جماعت کو مقرر فرمایا کہ طول وعرض کی پیمائش کریں تاکہ حقیقت معلوم ہو۔ معلوم ہوا کہ شیخ نے جو ایک سو بیس لکھا تھا وہ ترپن ۵۳ نکلا۔ چونکہ قرار داد یہ ہے کہ ہر ایک ملک اس جگہ تک ہے۔ جہاں تک لوگ اس ملک کی زبان میں گفتگو کریں۔ اس لئے بھولباس سے جو کشن گنگا سے اس طرف گیارہ کوس ہے۔ کشمیر کی سرحد مقرر ہوئی۔ اس حساب سے چھپن کوس ہوئے اور عرض میں دو کوس سے زیادہ فرق ظاہر نہ ہوا۔

شہر کا نام سری نگر ہے۔ دریائے بہت اس میں سے گذرتا ہے۔ اس کے سرچشمہ کو ویرناگ کہتے ہیں جو شہر سے چودہ کوس جنوب کی طرف واقع ہے۔ اس نیازمند کے حکم سے اس چشمہ کے سر پر عمارت اور باغ تیار ہوا ہے۔ شہر کے درمیان چار پل لکڑی اور پتھر کے بڑے مستحکم بنے ہیں۔ جن پر سے لوگ عبور کرتے ہیں۔ پل کو اس طرف کی اصطلاح میں کدل کہتے ہیں۔

شہر میں ایک بڑی عالی شان مسجد ہے۔ جسے سلطان سکندر نے ۷۹۵ھ میں بنایا تھا۔ ایک مدت کے بعد یہ جل گئی۔ پھر اسے سلطان حسین نے تعمیر کیا۔ ابھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ وہ فوت ہوگیا اور اسے ۹۰۹ھ میں ابراہیم باکرے (ماگرے) نے جو سلطان حسین کا وزیر تھا مکمل کیا۔ اس تاریخ سے اب تک ایک سو بیس سال ہوئے ہیں کہ قائم ہے۔ محراب سے مشرقی دیوار تک طول ایک سو پانچ درع اور عرض ایک سو چار درع ہے۔ اس میں چار طاق (محراب) ہیں۔ عالیشان ایوان اور ستون نقش و نگار سے مزین ہیں۔ بے شبہ یہ مسجد حکام کشمیر کی بہترین یادگار ہے۔

میر سید علی ہمدانی قدس سرہٗ چند دن اس شہر میں رہے۔ ایک خانقاہ ان کی یادگار ہے۔ شہر کے متصل دو بڑے تالاب واقع ہیں جو ہر سال پُر آب رہتے ہیں۔ ان کا مزہ نہیں

بدلتا۔

لوگوں کی آمد و رفت اور غلے اور ایندھن کا ادھر ادھر لانا لے جانا کشتیوں کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ شہر اور پرگنات میں پانچ ہزار اور[۵۷] سات سو کشتیاں ہیں۔ ملاح سات ہزار اور سات سو گنے گئے۔ کشمیر کی ولایت کے اٹھتیس[۳۸] پرگنے ہیں۔ یہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ بالائے آب کو آمراج اور پایان آب کو کامراج کہتے ہیں۔

اس ملک میں سونے چاندی کے پیسے دینے کی رسم نہیں۔ ہر جگہ نقد و جنس کا حساب شالی کے کھلیاں پر کرتے ہیں۔

کشمیر کی راہ دشوار گذار ہے۔ راہوں میں سب سے بہتر بھمبر اور پکھلی کی راہ ہے۔ اگرچہ بھمبر کا راستہ نزدیک تر ہے لیکن اگر کوئی چاہے کہ کشمیر کی بہار کو دیکھے تو پکھلی کا راستہ اختیار کرے۔ دوسرے راستے اس موسم میں برف سے مالا مال ہوتے ہیں۔

اگر ہم کشمیر کی تعریف اور توصیف لکھنے لگیں۔ تو دفتروں کے دفتر لکھنے چاہئیں۔ ناچار مجمل طور پر اس کے اوضاع اور خصوصیات تحریر ہوتی ہیں۔

کشمیر ایک سدا بہار باغ یا ایک آہنی حصار قلعہ ہے۔ بادشاہوں کے لئے ایک عشرت افزا گلشن اور درویشوں کے لئے دلکش خلوت کدہ ہے۔ اس کے تر و تازہ چمن اور دلکش آبشاروں کی کیفیت کوئی کس طرح بیان کرے۔ اس کے آبہائے رواں اور چشمہ سار حساب و شمار سے باہر ہیں۔ جہاں تک نظر کام کرتی ہے سبزہ اور آب رواں ہی دکھائی دیتا ہے۔ گل سرخ۔ بنفشہ۔ نرگس خودرو کے جنگل ہیں۔ اور قسم قسم کے پھول طرح طرح کے ریاحین شمار سے زیادہ ہیں۔ جان کو تر و تازہ کرنے والی بہار میں کوہ و دشت رنگا رنگ کے شگوفوں سے مالا مال۔ گھروں کے در و دیوار اور صحن و بام لالہ کی مشعل سے بزم افروز۔ چلکہائے مسطح اور سبزہ برگہائے مبروج کی نسبت کوئی کیا کہے ؎

شدہ جلوہ گر نازنینان باغ   رخ آراستہ ہر یکے چون چراغ
شدہ مشکبو غنچہ در زیر پوست   چو تعویذ مشکیں بباز وئے دوست
غزل خوانیٔ بلبل صبح خیز   تمنائے مے خوارگاں کردہ تیز
بہر چشمہ منقار بط آبگیر   چو مقراض زریں بقطع حریر
بساط گل و سبزہ گلشن شدہ   چراغ گل از باد روشن شدہ

بنفشہ سرِ زلف را خم زدہ
گرہ در دلِ غنچہ محکم زدہ

شکوفے کی بہترین قسم بادام اور شفتالو ہے۔ کوہستان کے باہر شگوفوں کی ابتدا اسفندار ند کی پہلی تاریخ کو۔ ملک کشمیر میں فروری کے شروع میں اور شہر کے باغوں میں ماہ مذکور کی نویں تاریخ کو ہوتی ہے۔ جب نیلی چنبیلی کا آغاز ہو تو شگوفے ختم ہو جاتے ہیں۔

ہم نے والدِ بزرگوار کی خدمت میں ایک سے زیادہ مرتبہ زعفران زار کی سیر اور خزاں کا تماشا دیکھا تھا۔ الحمدُ للہ اب بہار کی جوانیاں بھی دیکھ لیں۔ خزاں کی خوبیاں اپنے موقع پر تحریر ہوں گی۔

کشمیر کی عمارتیں سب لکڑی کی ہیں۔ دو چھتیں تین چھتیں بلکہ چار چھتیں ڈالتے ہیں۔ چھت پر مٹی ڈال کر لالۂ چوغاشی کی پیاز لگا دیتے ہیں۔ وہ سال بسال موسمِ بہار میں کھلتا اور بہت خوشنما ہوتا ہے۔ یہ کشمیر کا خاص تصرّف ہے۔ اس سال دولت خانہ کے باغیچے اور بامِ مسجد پر لالہ بکثرت کھلا۔ باغوں میں نیلی چنبیلی کی کثرت ہے۔ یاسمن سفید (جسے اہلِ ہند چنبیلی کہتے ہیں) بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ دوسری قسم کا یاسمن صندلی رنگ کا ہے یہ بھی نہایت خوشبودار اور کشمیر سے مخصوص ہے۔ گُلِ سرخ کئی قسم کے دیکھے گئے۔ ایک بڑا بڑا خوشبودار ہے۔ ایک اور گُل صندلی رنگ ہے۔ جس کی خوشبو لطافت اور نزاکت میں بڑھکر ہے۔ یہ گلِ سرخ کی قسم ہے۔ تنہ بھی اُسی جیسا ہے۔ گُلِ سوسن دو قسم کا ہوتا ہے۔ جو باغوں میں ہے وہ بڑا پلا ہوا اور سبز رنگ ہے۔ اور جو صحرائی ہے وہ اگرچہ کم رنگ ہے مگر خوشبودار زیادہ ہے گلِ جعفری بڑا اور خوشبودار ہوتا ہے۔ اس کا تنہ آدمی کے قد سے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن بعض سالوں میں جب بڑا ہوتا۔ پھول پر آتا اور پھول نکالتا ہے تو ایک کیڑا پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے گرد مکڑی کی طرح جالا تان کر پھول کو ضائع اور تنے کو خشک کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس سال ایسا ہی ہوا ہے اس سال جو پھول کشمیر کے ایلاقات میں نظر آئے وہ حساب شمار سے باہر ہیں۔ نادر العصر استاد منصور نقاش نے ایک سو سے زیادہ پھولوں کی تصویر کھینچی ہے۔

حضرت عرش آشیانی کے عہد سلطنت سے پہلے یہاں شاہ آلو نہ تھے۔ محمد قلی افشار نے کابل سے لاکر پیوند کئے۔ اب تک دس بارہ درخت پھل لائے ہیں۔ زرد آلو پیوندی کے بھی صرف چند درخت تھے۔ ان کا پیوند بھی اُسی نے اس ملک میں لگایا۔ اب بکثرت موجود ہیں۔

فی الحقیقت کشمیر کا زرد آلو بہت عمدہ ہے۔ کابل کے باغ شہر آرا میں ایک درخت میرزائی نام تھا۔ ہم نے اُس کے پھل سے بہتر پھل اور کہیں نہیں کھایا تھا۔ مگر کشمیر کے باغات میں اُس جیسے کئی درخت ہیں۔

ناشپاتی بھی اعلیٰ قسم کی ہوتی ہے جو کابل اور بدخشاں سے بہتر اور سمرقند کی ناشپاتی کے لگ بھگ ہے۔ کشمیر کا سیب خوبی میں مشہور ہے۔ امرود درمیانی درجے کا ہوتا ہے۔ انگور ہوتے تو بہت ہیں۔ مگر اکثر کھٹے اور خراب ہیں۔ انار زیادہ نہیں۔ تربوز عمدہ قسم کا ہوتا ہے خربوزے کی مٹھاس بہت تیز ہوتی ہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پکنے کے وقت اُس میں کیڑے پڑ کر اُسے ضائع کر دیتے ہیں۔ اگر اتفاقاً بچ رہے تو بہت ہی لطیف ہوتا ہے۔ شاہ توت نہیں ہوتا۔ عام توت بڑی تعداد میں ہوتا ہے۔ توت کے ہر درخت کے نیچے انگور کی بیل اُوپر لپٹ جاتی ہے۔ قصہ مختصر یہاں کے توت کھانے کے قابل نہیں۔ مگر جو چند درخت باغوں میں لگائے ہیں۔ اُن کے پتے ریشم کے کیڑوں کے کام آتے ہیں۔ اِن کے انڈے گلگت اور تبت سے لاتے ہیں۔

چنے کے سوا کئی قسم کے غلے ہوتے ہیں۔ اگر نخود کی کاشت کریں تو پہلے سال اچھا پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے سال خراب نکلتا ہے اور تیسرے سال مونگ کے برابر ہوجاتا ہے۔ چاول بہت ہوتے ہیں۔ بلکہ یوں کہو کہ یہاں تین حصے برنج اور ایک حصہ دوسرے غلے ہوتے ہیں۔

اہل کشمیر کی خوراک کا مدار چاولوں پر ہے۔ مگر یہ اچھے نہیں ہوتے۔ خشکہ تیار کرتے ہیں اور اسے سرد ہونے کے لئے رکھ دیتے ہیں۔ ٹھنڈا ہوجائے تو کھاتے ہیں۔ اسے بھتہ کہتے ہیں۔ گرم کھانا کھانے کا یہاں رواج نہیں۔ بلکہ کم سرمایہ لوگ پکے ہوئے بھتے کا ایک حصہ رات کو رکھ چھوڑتے اور دن کو کھاتے ہیں۔

نمک ہندوستان سے لاتے ہیں بھتے میں نمک ڈالنا دستور نہیں سبزی پانی میں اُبالتے ہیں اور ذائقہ بدلانے کے لئے تھوڑا سا نمک ڈال دیتے اور اُسے بھتے کے ساتھ کھاتے ہیں۔ اور جو لوگ ذرا تکلف کرنا چاہیں۔ تو اُس سبزی میں تھوڑا سا روغن چار مغز ڈال لیتے ہیں۔ یہ روغن جلدی تلخ اور بے مزہ ہوجاتا ہے۔ روغن گاؤ کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ ہاں اگر مکھن سے تازہ گھی بنا کر طعام میں ڈالیں تو خراب نہیں ہوتا۔ کشمیری زبان میں

اسے سز پاگ کہتے ہیں۔ چونکہ یہاں کی ہوا سرد اور نمناک ہے۔ اس لئے گائے کا گھی تین چار دن کے بعد متغیر ہوتا ہے۔

بھینس نہیں ہوتی۔ گائے بھی چھوٹی اور زبوں ہوتی ہے۔ گیہوں کم معتبر ہوتا ہے۔ روٹی کھانا یہاں کی رسم نہیں۔ بھیڑ پہاڑی قسم کی ہوتی ہے۔ اور وہ بھی بے چکتی ہندستانی اسے میندو (مینڈھا؟) کہتے ہیں۔ اس کا گوشت لطیف اور لذیذ ہوتا ہے۔

مُرغ۔ قاز (راج ہنس) مرغابی اور سو یہ (؟) وغیرہ بکثرت ہوتا ہے۔ مچھلی ہر قسم کی فلوس دار اور بے فلوس ہوتی تو ہے مگر خراب۔

مرزا حیدر کے عہد میں یہاں بہت سے ہنرمند اشخاص وارد ہوئے۔ موسیقی کی رونق بڑھی۔ کمانچہ۔ جنتر۔ قانون۔ چنگ۔ دف اور نے مروّج ہوئی۔ پہلے صرف ایک ساز کمانچے کی قسم کا تھا اور زبان کشمیری میں مقامات ہندی سے کام لیتے تھے۔ اور صرف دو تین مقام پر انحصار تھا۔ اکثر ایک آہنگ میں گاتے تھے۔ الحق کشمیر کی رونق میں مرزا حیدر کے بہت حقوق ہیں۔

شہر کے پاس ایک پہاڑی ہے جسے کوہ ماران اور ہری پربت بھی کہتے ہیں۔ اس کے مشرق کی طرف ڈل واقع ہے۔ اس کے دَور کی مسافت ساڑھے چھ کوس اور کچھ کسر پیمائش کی گئی۔ حضرت عرش آشیانی انار اللہ برہانہٗ نے حکم فرمایا تھا کہ اس مقام پر ایک قلعہ پتھر چونے سے بہت مضبوط بنایا جائے جو اس نیازمند کی حکومت میں قریب الاختتام ہوا۔ چنانچہ پہاڑی حصار کے درمیان پڑی اور قلعہ کی دیوار اس کے گرد بنی اور تالاب (یعنی ڈل) قلعہ سے مل گیا۔ دولت خانے کی عمارات ڈل کے کنارے پر ہیں۔ ان میں باغیچہ واقع ہے اور وہ مختصر عمارت اس کے وسط میں ہے۔ جہاں والد بزرگوار اکثر اوقات بیٹھتے تھے اس دفعہ وہ بڑی بے رونق اور خشک نظر آئی۔ چونکہ قبلۂ حقیقی اور خدائے مجازی کی نشست گاہ درحقیقت اس نیازمند کی سجدہ گاہ ہے۔ اس لئے اس کا ایسی حالت میں ہونا دل حق شناس کو سخت ناگوار ہوا۔ ہم نے معتمد خان کو جو بندگان مزاج دان میں سے ہے حکم دیا کہ باغیچہ کی ترتیب اور مکانات کی تعمیر میں پوری کوشش سے کام لو۔ چنانچہ اس کے حسن اہتمام سے تھوڑے عرصے میں اس جگہ نے تازہ رونق حاصل کر لی۔ باغیچے میں بلند چبوترہ بتیس درع مربع تین

قطعوں پر مشتمل آراستہ ہوا اور عمارت کو از سر نو تعمیر کر کے نادرہ کار استادوں کی بنائی ہوئی نقاویر سے رشکِ نگارخانۂ چین بنا دیا ہم نے اس باغیچے کا نام نور افزا رکھا۔
انہی دو تین دنوں میں ہم اکثر اوقات کشتی میں بیٹھ کر پھاگ۔ گاندربل اور شالمار کے شگوفوں کی سیر سے محظوظ ہوئے۔ پھاگ نام ایک پرگنہ ہے جو کوہ ڈل کے اطراف میں واقع ہے۔ اسی طرح شالمار بھی اس کے متصل ہے۔ ایک بڑی خوش منظر نہر ہے جو پہاڑ سے آکر ڈل میں گرتی ہے۔ ہم نے فرزند خرّم سے فرمایا تھا کہ اس کا آگا بند کر دیں۔ پس وہاں ایسی آبشار بن گئی جس کی سیر سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ یہ مقام کشمیر کی خاص سیرگاہوں میں سے ہے۔

ترجمہ

پیر غلام دستگیر صاحب نامی

آزادی

آزادی اطمینان قلب کا دوسرا نام ہے۔ یہ اطمینان قلب بہت سی چھوٹی چھوٹی پریشانیوں سے نجات پر مبنی ہے۔۔۔ آزادی کے لئے صحیح قسم کی تعلیم سے ہر شخص کا مستفید ہونا ضروری ہے۔ آزادیٔ تقریر آزادی اور خودداری کی بنیاد ہے ❖

(ورنون بارٹلٹ)

ہم سب بے جان انجنوں کی طرح ہیں۔ ہمارے فیصلے ہماری بحث اور ہمارا ووٹ دینا موقع کی صحیح جانچ پڑتال کے تحت نہیں ہوتا اِن کے لئے ہم اُن مخفی طاقتوں کے غلام ہیں جو وراثتاً یا بچپن کے واقعات کی وجہ سے ہم میں موجود ہیں۔۔۔۔ اگر ایک فرد کی آزادی کے متعلق مجھ سے پوچھا جائے تو میں کہونگا کہ یہ آزادی اس قابلیت کو کہتے ہیں جس کی بدولت انسان کسی موقع سے کما حقہ فائدہ اٹھا سکتا ہے بجائے اسکے کہ وہ اپنی اندرونی خواہشات کے سامنے بغیر جنگ کئے ہتھیار ڈال دے ❖ (ٹینگی لین)

سماجی نقطۂ نگاہ سے آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو اپنا کام اور تفریح کا سامان بغیر کسی رکاوٹ اور مناہی کے مل سکے جس حد تک کہ وہ دوسروں کی آزادی اور امن عامہ میں مخل نہ ہو ❖ (ایرک لنکلیٹر)

مکمل آزادی کے لئے ہماری ذہنیت کا بدلنا اشد ضروری ہے۔ اعتماد۔ محبت اور ذاتی منفعت کو قربان کرتے ہوئے دوسروں کو مدد دینے کی خواہش رکھنا ضروری ہے۔ "اپنی زندگی کے بچاؤ کیلئے ہمیں اسے کھونا ہوگا۔" یہ ہیں وہ شاندار الفاظ جن سے بہتر کچھ کہنا ممکن نہیں ❖

(سر ہیو والپول)

پنڈت پرتھوی ناتھ چکو
پروفیسر اقتصادیات

اقتصادی جنگ

عام لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا کی موجودہ جنگ جو ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی صرف مختلف ملکوں کے لشکروں کے درمیان لڑی جا رہی ہے۔ اور ہار جیت کا فیصلہ بھی یہی لشکر کریں گے۔ لیکن حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔ موجودہ جنگ گذشتہ جنگوں کی طرح صرف لشکری جنگ نہیں ہے۔ پچھلے جنگوں میں اکثر اوقات وہی لشکر فتحیاب ہوتا تھا جو تعداد میں دشمن کے لشکر سے زیادہ ہوتا سامان جنگ مقابلتاً کم اہمیت رکھتا۔ بحری جنگ میں بھی کامیابی کا انحصار تعداد ہی پر تھا۔

انیسویں صدی نے مغربی دنیا میں سائنس کی بدولت انسان کی زندگی میں کئی قسم کی تبدیلیاں پیدا کیں۔ ان کی بدولت سپاہ گری کے بعض آلات کو زیادہ مؤثر کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ اور کئی نئے آلات ایجاد کئے گئے۔ سٹیم انجن کی بدولت بحری اور بری فاصلے نہایت ہی کم وقت میں کٹنے شروع ہوئے۔ میدان جنگ کا سامان منزل مقصود پر بہت تھوڑے وقت میں پہنچنے لگا۔ توپوں کی کئی قسمیں وجود میں آئیں۔ بحری لڑائی میں ڈوبکنی کشتیوں اور تارپیڈو کا بے دھڑک استعمال ہونے لگا۔ ہوائی جہازوں کا استعمال فضائی حملوں میں کیا جانے لگا۔ غرضیکہ جنگ میں فتح پانے کے لئے صرف آدمیوں ہی کی ضرورت نہ رہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ ضرورت سامان جنگ کی ہونے لگی۔ ساتھ ساتھ مغربی دنیا میں ہر ایک ملک کے اقتصادی نظام میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ یہ ممالک اب صرف صنعتی چیزوں کو عروج دینے لگے۔ صنعتی کارخانوں کی تعداد بہت بڑھنے لگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ باقی دنیا سے دولت سمٹ سمٹ کر اُن کے ملک میں آنی شروع ہوئی۔ یہ دولت ان ممالک میں ایشیا، افریقہ اور دیگر پسماندہ ملکوں سے آنے لگی جہاں صنعتی چیزوں کے لئے ایک کھلا بازار تھا۔ یورپ اشیائے خوردنی اور اشیائے خام کے حاصل کرنے کے لئے ایشیا اور افریقہ کا محتاج ہونے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کے زمانے میں اشیائے خوردنی اور کچے مال کا مہیا ہوتے رہنا بھی اہم سوال ہوتا گیا۔

اس بحث کی وضاحت میں پچھلی بڑی جنگوں کا ذکر ضروری ہے۔ نپولین بوناپارٹ اور برطانیہ کی لڑائیوں میں سامان جنگ کی ضرورت گذشتہ لڑائیوں سے زیادہ تھی۔ مگر پھر بھی اگر اس لڑائی کا مقابلہ ۱۹۱۴-۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم کے ساتھ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جنگ کی ضروریات بہت مختلف تھیں۔ اسی طرح ۱۹۱۴ء کی جنگ کا مقابلہ اگر موجودہ جنگ سے کیا جائے تو کم از کم دو باتوں میں ان کا آپس میں فرق واضح طور

نظر آتا ہے۔ اول فوجوں اور سامان جنگ کی نقل و حرکت میں ریل اور موٹر لاری کا بہت زیادہ استعمال اور اسکی وجہ سے کوئلہ اور تیل کے بہت بڑے ذخیروں کی ضرورت۔ دوم جنگ میں ہوائی جہازوں کی حیرت انگیز وقعت۔ اور اس سے تیل کی ضرورت کا اور بھی بڑھ جانا۔ اسکے علاوہ کثیر التعداد لشکروں کے لئے خوراک دیگر ممالک سے حاصل کرنا اور سامانِ جنگ کے تیار کرنے کے لئے اشیائے خام کا مہیا کرنا۔ قصہ مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو ملک جنگ لڑ رہا ہو اسکے لئے آدمیوں کے علاوہ مندرجہ ذیل چیزوں کی ضرورت ہے۔ (۱) اشیائے خوردنی۔ (۲) ہوائی جہاز اور مختلف قسم کے اسلحہ جات اور ان کے بنانے کے لئے اشیائے خام۔ (۳) ذرائع آمد و رفت کے لئے کوئلہ اور تیل۔ ان ضروریات کا نام اقتصادی ضروریات ہے۔ موجودہ جنگ میں لڑنے والے ملک کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ دشمن کو اقتصادی ضروریات میسر نہ ہوں۔ یا کسی طرح سے کم ہو جائیں۔ یہ اقتصادی جنگ ہے۔

اب ہم دیکھیں گے کہ اقتصادی جنگ کس طرح لڑی جا رہی ہے۔ ہم برطانیہ کی مثال لیتے ہیں۔ برطانیہ نے جنگ کے چھڑ جانے پر ایک وزارت قائم کی۔ جس کا نام اقتصادی جنگ کی وزارت ہے۔ یہ وزارت مشہور ماہر اقتصادیات ڈاکٹر ڈالٹن کے زیر انتظام ہے۔ اس وزارت کا کام دشمن کی اقتصادی حالت کمزور کرنا ہے۔ اس وزارت کا لڑائی کی دوسری وزارتوں سے گہرا تعلق ہے۔ پرانی جنگوں میں برطانیہ کے بحری اور بری فوجوں کے جرنیل اور وزیر کسی بھی اور محکمے کو اپنے راز سے واقف نہیں کرتے تھے۔ مگر موجودہ دور میں اقتصادی جنگ میں کامیابی کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ بات بھی ماننا پڑی کہ فوجوں کے بڑے حاکموں کو اس نئی وزارت کے افسروں پر اطمینان رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ آج کل بحری و ہوائی طاقتوں کا اہم حصہ اقتصادی وزارت کے ماتحت کام کرتا ہے۔

اقتصادی جنگ میں برطانیہ چار ہتھیار استعمال میں لاتا ہے۔ (۱) جرمنی اور اطالیہ کی ناکہ بندی (۲) جرمنی سے پہلے غیر جانبدار ملکوں سے دھاتیں اور اشیاء خوردنی کا خریدنا۔ (۳) غیر جانبدار ملکوں میں چیزوں کے خریدنے کے لئے پیسہ جمع کرنا۔ (۴) جرمنی اور اطالیہ کے اقتصادی مرکزوں پر ہوائی حملے کرنے۔ جرمنی کے ہتھیار بھی اقتصادی جنگ میں قریب قریب یہی ہیں۔ جرمنی برطانیہ کی ناکہ بندی تو نہیں کرسکتا۔ مگر اسکی کوشش یہی رہتی ہے کہ وہ برطانیہ کی طرف جانے والے اور برطانیہ سے آنے والے جہازوں کو سمندر کی تہ میں بھیج دے۔ اس کے لئے جرمنی ڈبکنی کشتیوں اور ہوائی جہازوں کو استعمال کرتا ہے۔ برطانیہ اس کوشش میں ہے کہ جرمنی کو کچے مال تیل اور اشیائے خوردنی کا مہیا کرنا اتنا مشکل ہو کہ اس کے لئے جنگ کا جاری رکھنا ناممکن ہو جائے اور آخر شکست تسلیم کرے

جرمنی کو بھی معلوم ہے کہ اگرچہ انگلستان میں کوئلہ اور دھاتوں کی کمی نہیں ہے۔ تاہم اشیائے خوردنی کے لیئے وہ باقی ملکوں کا محتاج ہے اور امریکہ، کنیڈا، آسٹریلیا اور ہندوستان سے اسی قسم کی مدد آتی رہتی ہے۔ اگر یہ اشیا انگلستان میں درآمد نہ ہوسکیں تو ممکن ہے کہ برطانیہ پر جرمنی فتح پا سکے۔

اب ضروری ہے کہ ہم اس امر کی طرف توجہ دیں کہ تین سال کی اقتصادی لڑائی کے کیا نتائج ہوئے ہیں۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک یا دوسری طرف اقتصادی کمزوری کی علامات ظاہر ہو چکی ہیں۔ اس سوال کا جواب اطمینان بخش نہیں دیا جا سکتا۔ مگر ایک بات گذشتہ دو سال کی لڑائی سے ظاہر ہے ۔ کہ جرمنی کا زور شروع جنگ میں بہت زیادہ رہا۔ جرمنی کو فتح پر فتح نصیب ہوئی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ جرمنی کی تیاری کئی سالوں سے تھی۔ اور یورپ کے باقی ممالک خواب غفلت میں پڑے تھے۔ چنانچہ جنگ کی علامات نمودار ہونے پر بھی انہوں نے جنگ کا سامان تیار کرانے میں کچھ حصہ سرگرمی سے کام نہیں لیا۔ اقتصادی حالات میں بھی جرمنی اول اول مضبوط نظر آتا رہا۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ برطانیہ کی اقتصادی طاقت نے فوقیت دکھائی۔ اور اب حالات کی رو یہ ظاہر کر رہی ہے۔ کہ جرمنی برطانیہ کے مقابلے میں اقتصادی طور پر کمزور ثابت ہو رہا ہے۔

اس نتیجے پر ہم کس طرح پہنچے۔ پہلے ہم ناقہ بندی کا ذکر کرینگے۔ ناقہ بندی کا مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز سمندر کے راستے جرمنی یا اٹلی میں درآمد نہ ہو۔ اور نہ ہی کوئی چیز ان دو ملکوں میں سے برآمد ہو۔ شروع میں مال صرف جرمنی یا اٹلی میں پہنچنے سے روکنے کی کوشش کی گئی۔ مگر اس ناقہ بندی میں جنگ کے پہلے مہینوں میں برطانیہ کو کامیابی کم ہوئی۔ وجوہات یہ تھیں۔ جرمنی چین اور روس سے ولاڈی واسٹک کی بندرگاہ سے بذریعہ ٹرانس سائبیرین ریلوے مال درآمد کرتا رہا۔ مزید اس کے غیر جانبدار ممالک مثلاً سپین۔ رومانیہ۔ سوئزرلینڈ وغیرہ مال خریدتے اور اس مال کو خشکی کے راستے جرمنی روانہ کرتے رہے۔ جرمنی نے جب ڈنمارک اور ناروے پر قبضہ کیا تو اس کے لئے امریکہ سے مال خریدنا بہت آسان ہوگیا۔ چنانچہ اسوقت جرمنی نے امریکہ میں بہت سی چیزوں کی خرید و فروخت کا بندوبست کرنا شروع کیا۔ اگر جرمنی ان ممالک سے مال بلا روک ٹوک حاصل کر سکتا۔ تو ممکن تھا کہ وہ برطانیہ سے زیادہ اقتصادی طاقت حاصل کر لیتا۔ جس کا اثر برطانیہ پر بہت برا پڑتا۔ لہذا برطانیہ کی اقتصادی وزارت نے بحری طاقت کی مدد سے جرمنی کے اس خواب کو پورا ہونے نہیں دیا۔ چنانچہ بہت چیزیں جو

ممالک غیر سے جرمنی کے لئے روانہ ہوئی تھیں جرمنی نہ پہنچ سکیں۔ اسکے علاوہ امریکہ کے ساتھ بھی تجارت نہ ہوسکی۔ برطانیہ کی بحری طاقت نے جس احتیاط اور قابلیت سے ان مشکلات کا سامنا کیا دنیا کی تواریخ میں اپنی قسم کی ایک بے نظیر مثال ہے۔ خاص کر اگر اس بات کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ اٹلی کے جنگ میں شامل ہونے کی وجہ سے بحیرۂ روم کا راستہ جہازوں کو ہندوستان پہنچنے کے واسطے چھوڑنا پڑا اور اٹلانٹک کے بحر اوقیانوس میں جس میں جرمنی کی ڈبکنی کشتیاں زہریلے کیڑوں کی طرح گھات میں تھیں لمبا سفر کرنا پڑا۔ جہازوں کی حفاظت کے واسطے Convoy system شروع کیا گیا۔ ناقہ بندی کا کام جس کو اقتصادی وزارت نے بحری طاقت کے سپرد کیا تھا یوں سرانجام دیا جانے لگا۔

اقتصادی وزارت نے اپنے ایجنٹ ہر غیر جانبدار ملک میں مقرر کئے۔ ان کا کام یہ تھا کہ ہر ایک جہاز بندرگاہ سے روانہ ہونے سے پیشتر ایک سند دیں جسکا نام Navicert تھا۔ یہ سند صرف اس صورت میں دی جاتی جب اس ایجنٹ کو یقین ہو جاتا کہ یہ جہاز جرمنی کے لئے کوئی مال نہیں لے جا رہا ہے۔ یہ سند لیں سفر کرتے ہوئے جہاز اگر برطانیہ کے کسی گشت کرنے والے جہاز کو Navicert دکھاتا تو بغیر کسی چھیڑ چھاڑ کے اپنے منزل مقصود کی طرف روانہ ہوسکتا تھا۔ مئی ۱۹۴۰ کے بعد ناقہ بندی نے اس نئے انتظام کے تحت بہت اچھے نتائج دکھائے۔ اسکے بعد جرمنی کے برخلاف دوسرا ہتھیار بھی استعمال کیا جانے لگا۔ کہ اس کو غیر جانبدار ملکوں میں کسی قسم کا مال بھی خریدنے کا موقع نہ دیا جائے۔ برطانیہ ہی اس مال کو گراں داموں پر خرید لے۔ برطانیہ سے پہلے جرمنی نے اس دستور کو عمل میں لایا تھا اس نے رومانیہ۔ بلغاریہ اور یوگوسلاویا سے جنگ شروع ہونے سے پہلے مال خرید لیا۔ انگلستان نے جنگ کے شروع ہونے پر اپنے ایجنٹوں کو ان ملکوں میں بھیجا۔ اور وہ مال جو جرمنی خریدنے کے لئے تیار تھا انگلستان پہنچایا گیا۔ رومانیہ سے تیل اور دیگر بلقان حصوں سے اشیائے خوردنی کافی مقدار میں انگلستان نے خرید لیں۔

ان دو ہتھیاروں کے علاوہ ایک اور طاقتور ہتھیار اقتصادی جنگ میں یہ ہے کہ دشمن کے پاس غیر جانبدارانہ ملک میں مال خریدنے کی طاقت نہ ہو۔ یہ امر تشریح طلب ہے۔ بیچنے والے ملک کو اپنے سکے میں فروخت شدہ مال کے دام نہ ملیں تو مال فروخت نہیں ہوسکتا۔ کسی ملک کو دوسرے ملک میں مال خریدنے کی طاقت پھر صرف اس صورت میں ہوسکتی ہے جب اس نے دوسرے ملک کا کچھ سرمایہ حاصل کر رکھا ہو۔ یہ سرمایہ کئی طریقوں سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اول اگر ایک ملک دوسرے

ملک کو اپنا مال فروخت کرے تو اُس ملک میں اُس کا سرمایہ موجود ہوسکتا ہے۔ جرمنی کو اس طرح سرمایہ حاصل کرنے سے روکنے کے لئے اقتصادی وزارت نے جرمنی کے برآمد کے مال کی تجارت کو روکنے پر بہت زور دیا۔ شروع میں برآمد کے مال کے خلاف ناقہ بندی نہیں تھی۔ کیونکہ برطانیہ کے سیاست دانوں اور بحری فوج کے افسروں کا یہ خیال تھا کہ اگر جرمنی دوسرے ملکوں میں برآمد کے مال سے سرمایہ حاصل بھی کرے تو وہ اس سرمایہ کو استعمال نہیں کر سکیگا کیونکہ اگر اس سرمایہ کا استعمال اس ملک کا مال خریدنے کے لئے کیا جائے تو اس مال کو بحری فوج کے کشتی جہاز ڈبو دینگے۔ مگر بعد میں دیکھا گیا کہ یہ سرمایہ اگر مال نہیں خرید سکتا تو دوسرے ملک میں جاسوس ضرور خرید سکتا ہے اور پروپیگنڈا پر صرف ہوسکتا ہے۔ دوئم جرمنوں کے پاس برطانیہ کی جو ہُنڈیاں ہوتیں، تو وہ انکو برطانیہ کے سکوں میں بیچ کر امریکہ یا کسی اور ملک کے سکے میں تبدیل کر سکتے تھے۔ اور پھر اس سرمایہ کی مدد سے مال خریدا جاسکتا تھا۔ اس لئے برطانیہ نے سارے بنکوں کے نام یہ حکم دیا کہ اگر کوئی ایسی ہُنڈی اُن کے ہاتھ میں آئے جس کا مالک ایک جرمن ہو تو اسکو گورنمنٹ کے سپرد کیا جائے۔ جرمنی نے ایک اور تدبیر کا استعمال ایک عرصہ کے لئے کیا۔ وہ یہ تھا کہ جرمنی نے فتح شدہ ملکوں میں پونڈ کے نوٹوں پر ہاتھ ڈالا۔ اور اُن نوٹوں کو لزبن میں کم دام پر ڈالروں میں تبدیل کیا۔ ان ڈالروں کی مدد سے جرمنی نے امریکہ میں بہت مال خرید لیا۔ یہ نوٹ صرف انگریز خریدنے اور انگلستان اپنے بنکوں میں روانہ کرنے لگے۔ برطانیہ نے ان نوٹوں کو انگلستان میں آنے سے روکنے کی غرض سے ان کے لئے حکم امتناہی جاری کیا۔ ان سب تدبیروں کے علاوہ امریکہ نے جنگ میں آنے سے پہلے ہی جرمنی کی اقتصادی طاقت کو اس طرح بھی کمزور کیا کہ اُس نے اس کو فتح شدہ ملکوں کے سرمایہ پر جو امریکہ میں تھا ہاتھ نہ ڈالنے دیا۔

مندرجہ بالا بحث کے بعد اگر ہمارے سامنے یہ سوال رکھا جائے کہ فرانس۔ بلقان کے سارے ممالک اور باقی سارے فتح شدہ ملکوں کا اثر جرمنی کی اقتصادی حالت پر کیا پڑا ہے تو ہمکو یہ ماننا پڑتا ہے کہ باوجود ان ہتھیاروں کے جن کا ذکر آچکا ہے جرمنی کی حالت خراب نہ ہوئی۔ کیونکہ فتح شدہ ملکوں کی زراعتی اور صنعتی دولت جرمنی کے ہاتھ لگی ہے۔ جرمنی کے پاس کوئلہ کافی مقدار میں ہے۔ سامان جنگ بنانے کے لئے جن دھاتوں کا ہونا ضروری ہے وہ بھی فتح شدہ ملکوں سے کافی مقدار میں دستیاب ہوسکتی ہیں۔ اشیائے خوردنی بھی ان ملکوں سے جرمنی حاصل کررہا ہے۔ کیونکہ جرمنی کو اس امر کی مطلق پرواہ نہیں کہ اُن ملکوں کے پاس اپنی ضروریات کیلئے

Embargo

خوراک کافی ہے یا نہیں۔ پھر بھی اگر جرمنی کی اقتصادی حالت میں کوئی کمزوری ہے تو وہ میرے خیال میں صرف تیل اور ذرائع آمدورفت میں ۔ جرمنی کے پاس تیل کے ذخیرے موجود ہیں۔ اور تیل صاف کرنے کے کارخانے بھی۔ اور پھر تیل کی کمی ر دمانیہ کے تیل سے کسی حد تک پوری ہوسکتی ہے۔ مگر رومانیہ کا تیل جرمنی تک پہنچانا آسان نہیں۔ اس کی وجوہات یہ ہیں کہ تیل یا تو سمندری راستے سے پہنچ سکتا ہے یا خشکی کے راستے۔ سمندری راستہ ناقہ بندی کی وجہ سے خطرناک ہے اور خشکی کے راستے کا استعمال کم ریلوں کی وجہ سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ اس کمزوری کا فائدہ اٹھانے کے لئے اقتصادی وزارت نے ہوائی وزارت کو یہ ہدایت دی کہ ہوائی حملے صرف تیل کے ذخیروں۔ تیل صاف کرنے کے کارخانوں اور ریلوں کے جنکشنوں پر کئے جائیں۔ شروع میں اگرچہ بمباروں کے دستوں نے اپنے حملوں کو صرف انہی مرکزوں پر محدود نہیں کیا مگر وقت گذرنے پر اس ہدایت کی اہمیت واضح ہوئی اور اب ہوائی حملے عموماً صرف انہی مرکزوں پر کئے جاتے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کے شکست یاب ہونے میں اقتصادی جنگ کا اگر کوئی حصہ ہوگا تو وہ یوں ہی ہوگا۔ کہ جرمنی کو تیل کافی مقدار میں دستیاب نہ ہوسکے۔ اور اس کے ذرائع آمدورفت خراب کئے جائیں۔

جرمنی نے جو ہتھیار انگلستان کی اقتصادی حالت کو کمزور کرنے کے لئے استعمال میں لائے۔ اُن کا ذکر کرنا بھی لازمی ہے۔ جرمنی کا خیال تھا کہ جہازوں کو ڈبو دینے سے برطانیہ کے پاس نہ تو سامانِ جنگ پہنچیگا نہ اشیائے خوردنی۔ مگر اس بارے میں امریکہ کے جنگ میں شامل ہونے سے انگلستان کی بحری طاقت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس کے علاوہ جرمنی نے جو بمباری انگلستان پر ۱۹۴۰ء کے ستمبر میں شروع کی اس کا مدعا شاید یہ تھا کہ انگلستان کے لوگوں کے حوصلے ٹوٹ جائیں۔ اور وہ اپنی حکومت کو شکست تسلیم کرنے پر آمادہ کریں۔ یہ خیال جرمنی کا ویسا ہی خام نکلا جیسا کہ انگلستان کو اپنے مقبوضات سے سامان حاصل کرنے سے محروم کرنے کا۔ اس بمباری کا نقصان صرف یہ ہوا کہ مزدوروں کو بمباری ہونے سے پیشتر جائے پناہ میں جانا پڑا۔ اور اس وجہ سے روزانہ کئی گھنٹے ضائع ہونے لگے۔ مگر جرمنی کو اپنے ہوائی جہازوں کو دوسرے محاذوں پر بھیجنے کی وجہ یہ ہوائی حملے منقطع کرنے پڑے اور اس طرح بھی وہ انگلستان کو اقتصادی نقصان پہنچانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

غرضیکہ برطانیہ کی اقتصادی حالت جرمنی کے مقابلے میں روز بروز تقویت حاصل کر رہی ہے۔ اور امریکہ کے جنگ میں شامل ہونے سے اس میں کافی سے زیادہ اضافہ ہو رہا ہے۔

فاروقی

برابر کی چوٹ

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

ارشد :۔ ایک رئیس زادہ۔
شہداد :۔ ارشد کا دوست اور اخبار کا ایڈیٹر۔
طلعت آرا :۔ ایک جرائم پیشہ مہذب عورت۔
شبراتی :۔ ارشد کا ملازم۔
منظر :۔ ایک ملاقات کا کمرہ۔ ساز و سامان سے بھرا ہو۔

شہداد اور شبراتی باتیں کر رہے ہیں۔

شہداد :۔ آخر بات کیا ہے شبراتی! انتظار کی بھی حد ہوتی ہے۔ بارہ بجے سے راہ دیکھ رہا ہوں۔ ارشد ہیں کہ آنے میں ہی نہیں آتے۔
شبراتی :۔ حضور میل ملاقات جو بہت ہوئی۔ ملتے ملاتے دیر ہو ہی جاتی ہے۔ ذرا اور آرام فرمائیے۔ یہ بھی تو آپ ہی کا گھر ہے۔
شہداد :۔ ہاں یہ تو کہو۔ آج کل صحت کیسی ہے ان کی۔
شبراتی :۔ یونہی سی سرکار نہ چنگے بھلے ہیں نہ روگی۔ کچھ دبدا میں پھنسی ہے صحت ان کی۔
شہداد :۔ میرے ٹھہرنے سے سنبھل جائیگی طبیعت۔
شبراتی :۔ ہاں حضور بات یہ ہے کہ آپ کے سوا کسی سے دل کی بات کہتے ہی نہیں۔ دل پر بوجھ پڑا رہتا ہے ان کے۔ کچھ حیران سے رہتے ہیں۔ کئی دن سے کچھ سوچتے ہیں۔ مگر پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اس الجھاؤ سے آپ ہی نکالیں تو نکالیں۔ (آہستہ سے) گھنٹوں اکیلے بیٹھے آپ سے آپ باتیں کرتے ہیں۔ حضور جانتے ہیں۔ یہ کچھ اچھے لچھن نہیں۔ اللہ بخشے خالہ اماں کی بھی یہی حالت ہوئی۔ اور آخر میں پاگل خانہ کی سیر کرنا پڑی۔
شہداد :۔ او ہو! یہاں تک حالت پہنچ چکی ہے۔ اور مجھے آج خبر ہوئی۔ تو بھائی

میں تو قیامت تک یہاں سے جانے کا نہیں۔ مجھے بکیا صاحب سے ملنا تھا۔ ان سے میں ٹیلیفون پر ہی کہہ دیتا ہوں۔ کہ مجھے معاف رکھیں۔ کہاں ہے ٹیلیفون ؟

شبراتی:۔ اب کیا عرض کروں۔ فون تو اٹھا دیا۔ میاں کہتے تھے اسکی آواز کانوں کو بھلی نہیں معلوم ہوتی۔

شہداد:۔ یعنی طبیعت اتنی نازک ہو گئی۔ دماغ اسقدر کمزور ہو گیا۔ اچھا تو میں پڑوس میں سے پیغام دے کر آتا ہوں۔

شبراتی:۔ نہیں معلوم کیا ہونے والا ہے۔ لے لو میاں بھی آگئے۔ کیا کہتے ہیں ذرا سنوں۔

ارشد:۔ اپنے آپ باتیں کئے جانا اچھی عادت نہیں۔ میں اسے پسند نہیں کرتا۔

شبراتی:۔ کیا فرمایا حضور نے۔

ارشد:۔ شبراتی کیا کہہ رہے ہو۔ میں تو بولا تک نہیں۔

شبراتی:۔ میں سمجھا کوئی حکم دے رہے ہیں۔ حضور مرزا شہداد آئے تھے۔ حضور سے ملنے کے لئے بڑی دیر بیٹھے رہے۔ اب ذرا باہر گئے ہیں اور ابھی آتے ہیں۔ خدا عمر دراز کرے۔ میں چاء کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ (جاتا ہے) (شہداد آتا ہے)۔

شہداد:۔ ارشد۔ خانہ بہ مہماں گذاشت اِسی کو کہتے ہیں۔ ہفتوں شکل نہیں دکھاتے۔ خاصے عید کا چاند ہو گئے تم۔ خیر کہو کیسے ہو تم۔ چہرہ تو بہت اترا ہوا ہے۔ میاں کسی حکیم ڈاکٹر سے رجوع کیا ہوتا۔

ارشد:۔ اچھا۔ مجھے تو اسکا دھیان تک نہ آیا۔

شہداد:۔ کوئی خاص شکایت تو نہیں۔

ارشد:۔ بھول بھلیوں میں پھنس گیا ہوں۔ نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔

شہداد:۔ کچھ روپے پیسے کا جھگڑا ہے۔

ارشد:۔ اس سے بد تر۔ ایک لڑکی کے بالوں میں الجھ گیا ہوں۔

شہداد:۔ یہ تمنا خوراں کب سے حضرت۔ اچھا ذرا ہمیں پریم کہانی تو سنائیے۔

ارشد :- کوئی لمبی داستان نہیں ہے ۔ یہ کہ ایک دن ½ ۱۲ بجے لب دریا اس سے پہلی مرتبہ ملاقات ملائی ۔

شہداد :- اور تم رات کو ½ ۱۲ وہاں کس لئے تشریف لے گئے تھے ۔

ارشد :- کون کہتا ہے رات کو ۔ ارے میاں دن کو دن کو ۔

شہداد :- یعنی تم دن دھاڑے ایک اجنبی عورت کیسا تھ کھلم کھلا بات چیت کر رہے تھے اور جو کوئی دیکھ لیتا تو ۔

ارشد :- پہلے بات سن لو بھائی اور پھر لکچر بھی دے سکتے ہو ۔

شہداد :- اچھا کہئے ۔

ارشد :- وہ آگے آگے جا رہی تھی ۔ اور میں اس سے چند قدم فاصلے پر چل رہا تھا ۔ اتنے میں خدا کا کرنا ایسے ہوا کہ اسکا رومال زمین پر گر گیا ۔

شہداد :- اور تم جھٹ اٹھا کر ۔ گرد جھاڑ کر اسکے سامنے لے گئے ۔

ارشد :- میں کیا تم اور تم سا کوئی اور پارسا بھی ہوتا تو ایسا ہی کرتا ۔

شہداد :- پھر ۔

ارشد :- پھر کیا ۔ بس ایک آنکھ دیکھا تھا کہ چودہ طبق روشن ہو گئے ۔ اور اسکی محبت کی لہر میرے رگ رگ میں دوڑ گئی ۔

شہداد :- اور اس نے شکریہ ادا کیا ۔

ارشد :- مگر اس انداز سے کہ میں چاہتا تھا کہ قدم قدم پر اسکا رومال گرتا جائے اور میں اٹھاتا جاؤں ۔

شہداد :- اور ساری عمر اس شغل میں گذر جائے ۔ واہ رے میرے رومال بردار ۔

ارشد :- بس اسطرح بات سے بات نکلتی جا رہی تھی کہ

شہداد :- کہ تم نے اسکو گرین کیفے میں آنے کی دعوت دی ۔

ارشد :- پہلے اس بات کا فیصلہ کر لو کہ واقعہ میں بیان کر رہا ہوں یا تم ۔ بات کاٹتے چلے جاتے ہو ۔ کوئی کہے تو خاک کہے ۔

شہداد :- او ہو ۔ طبیعت کی روانی میں فرق آ گیا ۔ نئے زمانہ کے ادیب کیطرح تم نازک طبیعت کے مالک ہیں آپ ۔ ذرا حوصلہ اور برداشت درکار رہے گا

صاحب۔ چلئے صاحب۔ اور اکبن کیطرح چلئے۔ مجال جو کوئی آواز اٹکنے پائے
ارشد :۔ تو صبح وہاں جا بیٹھے۔ شہداد وُہ ایسی حسین معلوم ہوتی تھی۔ ایسی حسین کہ بس حسن ہی حسین تھا سارے کمرے میں۔ مکمل حسن تھا مکمل۔ ایڑی سے چوٹی تک جمال میں ڈوبی ہوئی۔ اور اخلاق بس میں اور کیا کہوں۔ اگر اخبار لکھنے کی وجہ سے سٹری نہ ہوگئے ہو تم تو خود سمجھ جاؤ۔ اگر اسکا ذکر اپنے اخبار میں کرو تو اخبار میں بھی تمہارے چاند لگ جائیں۔
شہداد :۔ کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ ایسی فضا میں ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ مگر میں یہ سننا چاہتا ہوں کہ تم پر کیا افتاد پڑی۔
ارشد :۔ اس نے بتایا کہ اس دنیا میں تن واحد ہے۔ نہ اسکا کوئی نہ وُہ کسی کی۔
شہداد :۔ یہ تو مفید مطلب رہی۔
ارشد :۔ وہاں سے اٹھکر ہم سینما چلے گئے۔
شہداد :۔ اور تماشہ ختم ہونے پر رات کا کھانا پھر وہیں ہوٹل میں کھایا گیا۔
ارشد :۔ ہاں۔
شہداد :۔ اور دوسرے دن۔ اسکے اخلاق اور حسن کے شعر گنگناتے ہوئے پھر تم وہیں۔
ارشد :۔ ہاں ہاں۔
شہداد :۔ سنبھل جائیے حضرت (ہنستا ہے) اور کھانے کے بعد تم میوہ یا میوہ کا رس وقت کی ضرورت کے مطابق استعمال کرتے رہے۔ اور شام ہوگئی اور پھر سینما ہوا اور تم پھر اس کے جمال و اخلاق کے گن گاتے ہوئے گھر لوٹے۔
ارشد :۔ ایکدن میں اسکو نکاح کی دعوت دے بیٹھا۔ اور اب میں سوچ رہا ہوں۔ کہ میں نے یہ کیا کیا۔
شہداد :۔ مگر حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے پچھتاوے کی خاص وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔
ارشد :۔ بہت سوچا۔ گھنٹوں سر مغزن کیا مگر کوئی بہانہ نہیں ملتا۔ جسکی آڑ لیکر اس وعدہ سے چھوٹ نکلوں۔ اور وہ کہ جلد سے جلد تکمیل کا تقاضہ کئے جاتی ہے۔
شہداد :۔ یہ تو میری بات کا جواب نہیں۔ مجھے وجہ بتائیے حضرت وجہ۔
ارشد :۔ اتنی پہیلیاں بوجھ چکے یہ بھی بھانپ جائیے۔
شہداد :۔ ذرا بد مزاج ہے۔

ارشد :۔ یہ کوئی بات نہیں۔ تمام عورتیں کم یا زیادہ چڑچڑی ہوتی ہیں۔ اور مرد آہستہ آہستہ انہیں درست کر لیتا ہے۔ طلعت بھی ذرا تیکھے مزاج کی ہے۔ مگر اسکا کوئی غم نہیں۔ اور شاید یہ اسکی زیادہ تعلیم کیوجہ سے ہے۔

شہداد :۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔

ارشد :۔ میں یہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں۔ مگر پیٹو عورت سے میرا بیاہ نہیں ہو سکتا

شہداد :۔ عورت اور پیٹو توبہ۔ توبہ۔

ارشد :۔ ارے بھائی اسقدر کھاتی ہے کہ دانتوں کی چکی ایک منٹ کے لئے بند نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دن بھر اسے کچھ کھانے کو نہیں ملا۔

شہداد :۔ میں مانتا ہوں کہ ایسی عورت سے زندگی بسر کرنا بہت کٹھن ہے ۔ تم اسے جواب کیوں نہیں دے دیتے۔

ارشد :۔ یہی تو میں چاہتا ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس سے خلاصی پاؤں تو کیسے۔ طلعت بڑی منچلی عورت ہے۔ وہ تو جناب مجھے عدالت میں کھینچ لے جائیگی۔

شہداد :۔ مگر تم اس سے اسقدر ڈرتے کیوں ہو۔

ارشد :۔ وہ تو قانون دانوں کے کان کاٹتی ہے۔ کئی دفعہ باتوں باتوں میں نقض معاہدے کی داستانیں سنا چکی ہے۔ دیکھو نا۔ اخباروں میں چہ میگوئیاں ہونگی تم کہاں تک ان کا منہ بند کرو گے۔ لوگ تھڑی تھڑی کرینگے۔ بس یہ بات یاد آتی ہے تو کانپ اٹھتا ہوں۔ آج وہ دو ٹوک فیصلہ کرنے آرہی ہے۔ بس آیا ہی سمجھو اسے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کروں تو کیا کروں۔

شہداد :۔ ایک بات سمجھ میں آئی۔ میں اس کے آنے تک یہاں ٹھہرونگا۔ یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ اور مجھے امید ہے کہ میں تمہیں اس جال سے نکال لونگا۔ تم ایک کام کرنا جو کچھ میں کہوں کہنے دینا۔ ذرا دخل نہ دینا (شبراتی آتا ہے)

شبراتی :۔ حضور طلعت خاتون صاحبہ تشریف لائی ہے۔

ارشد :۔ ہاں ہاں شوق سے آئیں۔ (طلعت آتی ہے)

طلعت :۔ ارشد کیا کر رہے ہو۔

ارشد :۔ تمہارا انتظار اور شہداد سے باتیں۔ یہ میرے دوست مرزا شہداد اور

اخبار "نگہبان" کے مالک مدیر۔ یہ ہیں طلعت تاتو ان جن کے حسن و اخلاق کی میں اکثر تعریف کیا کرتا تھا۔ جن سے میری شادی کا اصرار یا ئی ہے۔

شہداد :۔ اچھا بات پکی ہوگئی۔ اور یہ روائی چادر کا پیام تک نہ ملا۔ بیگم صاحبہ آپ کی ملاقات سے بڑی خوشی ہوئی۔ مگر یہ تو بتائیے کہ اندر ہی اندر یہ کھچڑی کب سے پک رہی تھی۔

طلعت :۔ کوئی تین ہفتے کی بات ہوگی۔ مگر اس گھر میں کھانے کو کچھ نہیں میں تو بھوک سے مر رہی ہوں۔

ارشد :۔ ابھی سب کچھ آجاتا ہے۔

شہداد :۔ بیگم صاحبہ آجکل موسم خوب ہے۔

ارشد :۔ ذرا اور ٹھنڈ ہو جائے تو بھوک خوب لگے۔

شہداد :۔ بیگم صاحبہ کبھی کبھار سینما جایا کریں۔

طلعت :۔ ارشد ایک دن لے گئے تھے۔ مگر کچھ لطف نہ آیا۔ الٹی بیزاری ہوئی۔

شہداد :۔ کیوں۔ کیا بیزاری ہوئی۔

طلعت :۔ یہ سب ارشد کی مہربانی تھی۔

ارشد :۔ میری۔ میں نے کیا خطا کی۔

طلعت :۔ وہی بھول جانے کا مرض۔ تین گھنٹے بیٹھے اور حرام ہے جو اس خدا کے بندے نے پوچھا تک ہو کہ کچھ کھاؤ گی۔ یہ تماشا دیکھتے رہے۔ اور میری آنتیں قل ہو اللہ پڑھتی رہیں۔

شہداد :۔ اتنا تو میں کہوں گا۔ ارشد بھائی معاف کرنا تم ضرورت سے زیادہ بے پروا ہو۔ بیگم صاحبہ ابھی آپنے کیا دیکھا ہے شادی کے بعد قدر و عافیت معلوم ہوگی۔

ارشد :۔ شاہ داد کیا کہہ رہے ہو۔

شہداد :۔ میں سچی بات کہنے سے نہ رکوں گا تم لاکھ برا مانو۔ اپنی اپنی طبیعت کسی کا اجارہ نہیں اس میں۔

ارشد :۔ مگر میں۔

شہداد :- تم لاکھ اشارے کرو مگر خدا لگتی کہوں گا ضرور۔
ارشد :- آخر کوئی بات،
شہداد :- بیسوں دفعہ کہہ چکا کہ طبیعت سے مجبور ہوں۔ بیگم صاحبہ شاید آپ کو معلوم ہے کہ اس شخص سے جس کو ارشد کہتے ہیں محبت کا دم بھر کر آپ سانپ کو آستین میں پال رہی ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ حضرت اپنی معاش کسطرح پیدا کرتے ہیں۔
طلعت :- ارشد نے مجھے بتایا تھا کہ ان کی جاگیر سے آمدنی معقول ہے۔ کہیں یہ غلط تو نہیں
شہداد :- بے شک اس کی آمدنی معقول ہے۔ مگر آپ نے دریافت کیا ہوتا۔ کہ یہ کس قسم کی جاگیر ہے۔ اور آمدنی کیسی ہے۔ مزہ یہ ہے کہ اسوقت بھی اسی آمدنی پر اوقات بسر کر رہے ہیں۔
ارشد :- شہداد تم کہاں جا رہے ہو۔
شہداد :- جہنم کو۔ جہاں تم اس معصوم الھڑ لڑکی کو لے جانا چاہتے ہو۔ ارشد تم میرے دوست ہو۔ مگر یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ اس نادان بچی کی معصوم جوانی کو تم اسطرح تباہ کرنے پر آمادہ ہو اور میں اس کو آگاہ نہ کروں۔ کبھی نہیں ہو سکتا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔
ارشد :- سبز ی تو پی کر نہیں آئے۔
شہداد :- جو چاہو کہو مگر اپنا فرض بجا لانے سے باز نہیں رہ سکتا۔ بیگم صاحبہ آپ پر سب حال روشن کرنے سے مجھے دُنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ آپ کی آنکھوں پر مکر و فریب کا گھٹا ٹوپ چڑھا یا گیا ہے۔ جب میں اس کو اتار دونگا تو میاں ارشد آپ کو اصلی روپ میں نظر آئیں گے۔ بیگم صاحبہ آپ جانتی ہیں پتے باز کیسے ہوتے ہیں۔
طلعت :- میں تو آج ہی یہ قصہ سن رہی ہوں۔
شہداد :- بیگم صاحبہ پتے باز آجکل کا ٹھگ ہے۔ یہ ایک گروہ ہوتا ہے جو ناتجربہ کار نوجوانوں کو دغا و فریب سے اپنے جال میں پھنساتا ہے۔ یہ میاں ارشد اس گروہ کے سرگروہ ہیں اور یہی ان کی جاگیر ہے جس کی آمدنی پر ان کو

ناز ہے۔ پولیس ان کے درپے ہے اور گھڑی پل میں گرفتار ہونے ہیں۔

ارشد :- شہداد تم میری دوستی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔

شہداد :- چپ رہو۔ یہ آنکھیں کسی اور کو دکھاؤ۔ مجھ پر یہ جادو نہیں چلنے کا۔ بیگم صاحبہ یہ سنکر آپ کو تعجب ہوگا۔ کہ اس پر بھی میں ارشد کا دوست کیوں ہوں۔

طلعت :- ہاں یہ بھی بتا دیجئے۔

شہداد :- بیگم صاحبہ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ کان تلے کی باتیں کہنے میں شرم آتی ہے مگر آپ کی خاطر کہے دیتا ہوں۔ مجھ میں سب سے بڑا نقص کانوں کا کچا ہونا ہے۔ میں ان کی باتوں میں آگیا۔ پہلے ان کا ہاتھ صرف مردوں پر صاف ہوتا تھا۔ اب انہوں نے چند دنوں سے لڑکیوں کو بھی پھنسانا شروع کیا ہے۔ اور میں اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ خاصکر بیگم صاحبہ آپ کا حسن۔ آپکے اخلاق۔ آپ کا حسن مجھے اجازت نہیں دیتا کہ ٹک ٹک دیکھتا رہوں اور آپ کو ناپاک روح سے شادی کرنے دوں۔ اور سچ سچ میں نے سب کچھ آپ کو سمجھا دیا۔ اب بیگم مالو نہ مالو اختیار ہے۔ ارشد تمہیں مناسب یہی دیتا ہے۔ کہ اس خاتون کے قدموں پر جھک جاؤ۔ اور معافی مانگو۔

طلعت :- ارشد کیا یہ سچ ہے۔

ارشد :- ہاں۔

طلعت :- پہلے کیوں نہ بتایا۔

ارشد :- خیال نہ آیا۔ اب میرے خیال میں اسکی تلافی صرف ایک صورت میں ہوسکتی ہے کہ میری جگہ شہداد بھائی قبول فرمائیں۔

شہداد :- (خوش ہوکر) میرے نصیب کہاں ایسے۔ کہاں بیگم اور کہاں میں۔

ارشد :- طلعت میں تم سے معافی مانگتا ہوں اور تم کو عہد نکاح سے آزاد کرتا ہوں۔

طلعت :- اس کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں اس معاملہ میں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے۔

ارشد :- اسکی کیا ضرورت ہے۔ جو ہوگیا سو ہوگیا۔ ہمیں اسکو ایک خواب سمجھنا چاہئے۔

طلعت :- کیوں بچوں کی باتیں کرتے ہو۔ اب میری سنو تو تم کو تسکین ہو جائیگی دنیا

میں کوئی عیب سے خالی نہیں۔ میں بھی سراسر پاک دامن نہیں۔

شہداد و ارشد ۔ (مختلف جذبات کے تحت) جھوٹ بول رہی ہو۔

طلعت ۔ یہ سونے کے بٹن جو میرا پہلا تحفہ تھا۔ سگریٹ کیس جس میں جواہرات جڑے تھے۔ اور یہ انگشتری جو کل میں نے تم کو دی یہ تمام چوری کی چیزیں ہیں جو میں نے مختلف اوقات پر مختلف جگہوں سے اٹھائیں۔ خرید کر تمہیں پیش نہیں کی گئیں۔ اس حالت میں میں تم کو کیا الزام دے سکتی ہوں۔

ارشد ۔ تمہارا مطلب کہ تم چور ہو۔

طلعت ۔ اٹھالانا زیادہ آسان اردو ہے۔ خیر چور ہی سہی بے شک میرا پیشہ تمہارے کام کے رتبہ کو نہیں پہنچتا۔ اور شہداد صاحب کا ڈھنگ بالکل نرالا ہے۔ ان کو ہماری طرح پولیس کا خطرہ نہیں۔

شہداد ۔ ارشد ۔ اللہ میرے۔ یہ عورت ہے۔

ارشد ۔ باز آیا میں ایسے دل کے لگانے سے۔ کسی اور جگہ قسمت آزمائی فرمائیے۔ میں نے کہا اور تم نے کر دکھایا۔

(ارشد جھک کر آداب بجالاتا۔ طلعت کھسیانی ہنسی ہنستی ہے)
(شہداد اپنی ڈائری نکال کر لکھنا شروع کر دیتا ہے۔)

پردہ

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے	یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں	غالب
بہلا نہ دل نہ تیرگیٔ شام غم گئی	یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں	فانی
اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق	وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے	غالب
آ گئی ہے ترے بیمار کے منہ پر رونق	جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارمان نکلا	فانی
ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی	ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی	اقبال
تاکید ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی	مطلب یہ ہے کہ دور سے دیکھا کرے کوئی	فانی
سید گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں	مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں	
آشیاں پر کرم برق کی باری آئی	مژدہ اے ذوق بلا باغ میں صیاد نہیں	فانی
آشنا ہو کے آستاں سے ترے	جھک سکی پھر مری جبیں نہ کہیں	اثر صہبائی
جھک گیا تیرے آستاں پہ جو سر	پھر کسی آستاں پہ خم نہ ہوا	فانی

ریت کا گھروندا

ملائم قالین پر کوئی دبے پاؤں چل رہا تھا .... دھیمی دھیمی سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ سمیرا نے چونک کر سر اٹھایا۔

"یہ تم ہو پیارے؟" سمیرا نے کہا۔

"ہاں میں ہوں .... تمہارا ریاض۔ جاگتی ہو ابھی تک؟ میں نے سمجھا کہ تم سو گئی ہو گی! اسلئے پنجوں کے بل چل رہا تھا کہ تم بیدار نہ ہو جاؤ۔ مگر سوئی کیوں نہیں ابھی تک؟" "میں سو نہ سکی۔ میں اپنے ریاض کا انتظار کر رہی تھی۔ میں بہت پریشان رہی ہوں شکر ہے کہ تم آگئے ہو ...... خیر ... ادھر آؤ .... آؤ ذرا میرے قریب آؤ .... آؤ نا ...."

دو ترسے ہوئے بیقرار ہاتھوں نے ایک جھکے ہوئے گلے کے گرد ہالہ کر لیا۔

چاند کھڑکی کے کھلے ہوئے پٹ سے جھانک رہا تھا۔ پورا چاند نیلگوں آسمان پر چمک رہا تھا آسمان اسوقت پانی کی ایک نتھری ہوئی جھیل کی طرح تھا جس میں چاند کا بجرہ خاموشی سے چل رہا ہو۔ تمام عالم پر کافوری رنگ چڑھا ہوا تھا۔ فضا میں ہیرے کا برادہ اڑ رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سبزے پر لوٹ لوٹ کر گدگدا رہے تھے۔ کھڑکی کے سپید پردے ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ روشنی سمیرا کے آدھے چہرے پر پڑ کر اس کے رنگ کو اور بھی زرد بنا رہی تھی۔ وہ اپنی سفید بستر پر کھڑکی کا سہارا لئے بیٹھی تھی۔ اسکا بیمار اور مسکان چہرہ اور بھی اداس نظر آنے لگا تھا ـــــ سارا منظر بہت ہی یاس انگیز تھا۔ روشنی دکھ کی ایک لہر نظر آ رہی تھی۔

وہ کہہ رہی تھی "میرے بنیا بسینے کے ساتھ جمٹ جاؤ۔ میں بہت اداس رہی ہوں تم کہاں رہے ہو اتنی دیر؟ ...... ہاں .... شاید کچھ کام ہوگا تمہیں ــــ اسی لئے تم اتنی دیر سے آئے ہو ..... خیر .... اب جبکہ تم آگئے ہو مجھے گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تم میرے کسقدر قریب ہو! ..... آہ میں تمہیں اس طرح اپنے قریب پاکر کسقدر خوش ہوں۔ تمہارے سانس کی نشیلی

خوشبو ...... آہ میرے ساتھ لگ جاؤ میرے پیارے ...... "

ایک ثانیہ کے لئے فضا میں سکوت رہا اس کے بعد ریاض نے دو جلتی ہوئے تاریک گڑھوں کے درمیان دو ترسی ہوئی تاریک آنکھوں پر ایک مرصع بوسہ دیا۔ اور اس طریقے سے اس نے اپنی بیوی کا تمام دکھ چوس لینے کی کوشش کی — ایک گندی جونک کی طرح۔ یہ اسکا جواب تھا۔

سمیرا بے خود سی ہوگئی اور ایک سہمی ہوئی بے بس ہرنی کی طرح اسکی چھاتی سے چمٹ گئی۔

"جی چاہتا ہے اسی طرح تمہارے سینے سے لگی رہوں۔ اور اسی طرح — تمہارے دل کی دھڑکنیں گنتی ہوئی فنا ہو جاؤں میرے ریاض۔ تم نے میرے مردہ تن میں روح ڈالدی ہے ...... افسوس کہ میری آنکھیں نہیں ہیں ورنہ تم ان کی چمک دیکھکر میرے خلوص کا اندازہ لگا سکتے میری محبت کی شدت کو محسوس کر سکتے ...... اب تو یہ ہاتھ ہی میری آنکھیں ہیں۔ انہی کی بدولت تمہیں دیکھتی ہوں میرے پیارے اور ...... اور اتراتی ہوں کہ تم ایسا وفادار خاوند ملا ہے ...."

"کیا سچ مچ ؟ اوہ! میری نادان سمیرا تم تو بڑی جذباتی ہو۔ مجھے بہلا تو نہیں رہی ہو ؟"

ریاض نے ہنستے ہوئے فقرہ کسا اور ایک مبہم سی حرکت کی۔ اس کے اس انداز سے کچھ تکان سی ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے سمیرا کے بازوؤں سے نکلنے کی کوشش کی۔ سمیرا پا گئی۔ بولی۔

"بے شک تم اکتا گئے ہوگے مگر ...... مگر میرا بھی تو کچھ خیال کرو میرے ریاض میں تو تمہاری موجودگی میں زندگی میں لذت محسوس کرتی ہوں۔ تمہیں اسقدر قریب پا کر مجھ پر کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔ اس فضا میں ایک میٹھا میٹھا تشنج پیدا ہوتا ہے ...... اور اس میٹھے میٹھے درد کی دلنوازیوں سے میں بیہوش سی ہونے لگتی ہوں ...... میں اندھی ہوں مگر میں تمہیں دیکھ سکتی ہوں میرے پیارے ...... تھوڑی دیر اور بیٹھو اور میرا دل بہلاؤ۔ کوئی نئی بات سناؤ ...... سناؤ نا ...... "

ریاض نے ایک سرد آہ بھری — اور گویا ہوا۔

"بلوط کے شگوفے پھوٹ چکے ہیں۔ جھیل کی سیمیں سطح پر نیلوفر کی لاتعداد آدھ کھلی کلیاں ہوا کی چھیڑ چھاڑ سے رقص کرتی ہیں۔ بلوار ڈ کے کنارے لمبے ترنگے سفیدوں کی دو رویہ قطاریں آنکھوں کی تازگی کا سامان کرتی نظر آتی ہیں اور ...... بید مجنوں بہت دلنواز ہے — چھوٹی چھوٹی لاتعداد جھولتی ہوئی پتیاں ...... — خیر یہ تو ہے ابتدائے بہار کی دلفریب عریانیوں کا اجمالی سا

مرقع ۔ ہاں آج تمہاری سہیلی برجیس ملی تھی ۔ تمہاری طرح بڑی حسین ہے ابھی تک ۔"
اپنی تعریف سن کر (ایک شرمیلی مسکراہٹ سمیرا کے چہرے کی شکن کپڑے کی سلوٹ کی طرح دور کرتی ہوئی غایب ہو گئی ۔)
"مجھے ذرا وضاحت سے بتاؤ پیارے وہ اور کیا کہتی تھی ؟ مجھے سلام بھیجا ہوگا ؟ بڑی اچھی سہیلی ہے میری ۔ مگر کیا بدستور خوبصورت ہے ؟ اور ...... اور کیا میں بھی واقعی ایسی ہوں جیسی تم مجھے بتاتے ہو ؟ ..... مگر پیارے یہ کچھ بے معنی سا سوال ہے ...... مجھے تو اس بات کا یقین نہیں آتا کہ میں ابھی ویسی ہوں جیسی کہ آج سے پانچ سال پہلے تاریک سالوں میں کھو جانے سے پیشتر تھی ۔"
"آہ میری سمیرا تم پھر شک میں پڑ گئی ہو ۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم ابھی بدستور دلکش ہو ۔ تم سرمائی ابتدائی برف کی طرح خوبصورت اور دلکش ہو اور بہار کی سب سے پہلے کھلنے والی کلی کی طرح شوخ و شنگ ۔ تمہاری خوبصورت مست لٹیں تمہارے رخ روشن کو اوٹ میں لئے ہوئے ...... آہ ایک برساتی بادل کی طرح جو پانی کی شراب پی کر لڑکھڑاتا ہوا بڑھتا ہے اور آفتاب کو اپنے میلے دامن میں گھیر لیتا ہے ۔ اس وقت تمہارے رخ کے مدہم نقوش کیسے دلفریب ہیں جیسے صبح کی دھند کے پتلے پردے میں لپٹی ہوئی دور کے کسی پہاڑ کی چوٹی ۔ فردوس نظر ۔ جنت نگاہ ...... میری پیاری میں تمہاری لازوال محبت کے باعث لازوال ہو رہا ہوں ۔ تم نے مجھے حیات نو بخشدی ہے ۔"
چند لمحے کامل سکوت رہا ۔
"..... خیر .... مگر جو کچھ ہوں تمہاری ہوں ۔ اچھی ہوں یا بری جانچ لو مگر ..... ایک اور بات پوچھتی ہوں بتاؤ گے نا ؟ ..... بھلا وہ عورت کہاں ہے وہ ...... وہ جو ..... جو یہاں نہ جانے کیا کرنے آئی تھی ...... اسدن ..... بھول گئے کیا ؟ وہ جس نے کچھ غلط فہمی پیدا کر دی تھی ..."
"تم نیلوفر کے متعلق پوچھ رہی ہو ؟ اور وہ بیچاری تو ایک گھریلو قسم کی عورت ہے ایک بھروس بڈھی ۔ پوچھنا ہوگا بھلا ایسے بھی کوئی ۔؟ سر کے بال سفید ۔ منہ پر جھریاں ۔ عمر چالیس سے اوپر ۔ کیا حیثیت ہے بیچاری کی تمہارے سامنے ؟"
"..... ایسے ہی ہوگی ..... مگر نہیں ..... یوں تو بڑی حسین اور جوان معلوم ہوتی ہے ۔ باتیں بے باکانہ کرتی ہے غیر مردوں سے مگر بولتی کیسے ہے ! یہ میں ضرور کہونگی ، اسکی آواز ہے بڑی

جھنکاردار۔ شعلہ سا چمکتا ہے جب بات کرتی ہے۔ اسکی رسیلی آواز مدہوش کن ہے۔ جیسے دُور کہیں نقرئی گھنٹیاں نسیم کے لوٹ لوٹ کر چلنے سے بیزار ہوکر فریاد کررہی ہوں۔..... پتہ نہیں تم کیسے کہتے ہو کہ وہ ادھیڑ عمر کی ہے ...... معاف کرنا...... مگر تم مجھے فریب کیوں دے رہے ہو؟"

"ہونہہ۔ بھئی بڑی نادان ہو۔ کیا میں اپنی سمیرا کو فریب دونگا؟ چھوڑو ان دلشکن باتوں کو........ دوائی پی لی تھی تم نے؟"

سمیرا بہت پریشان تھی۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ بول سکی۔ اُس نے رفتہ رفتہ ریاض کی گردن چھوڑ دی۔ اسکی بیقرار انگلیاں اندھیرے میں ہوائی دھاگوں سے ایک نامعلوم چیز بُن رہی تھیں۔ اسکے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ہاتھ جو ہڈیوں کے دو مُٹھے تھے جن پر بے رنگ سی کھال منڈھی ہو۔ وہ اندھیرے میں ریاض کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی جیسے کہ اسکی بے نور آنکھیں دیکھ سکیں گی۔ جیسے کہ اسکے دل کا حال پڑھ سکیں گی۔ ریاض اسکو ایک معصوم بچے کی طرح تھپکنے لگا۔ خاموشی پوری شدت کے ساتھ چھا گئی.....

اُس رات کی دلفریب گفتگو ختم ہوتی ہے۔

سمیرا گزشتہ کئی سال سے اندھی ہو چکی تھی۔ آغازِ جوانی میں ہی ــــ جب اسکے حسن کا آفتاب ابھی نصف النہار پر نہ آیا تھا۔ اسکی خوبصورت بنفشی آنکھوں کی روشنی دھندلی ہو چکی تھی۔ بہت جلدی ہی وہ رہی سہی روشنی بھی کھو بیٹھی۔ بظاہر دُنیا سے اُس کا تعلق ٹوٹ گیا۔ وہ اگرچہ دُنیا کی حد میں رہتی تھی مگر دُنیا سے دُور تھی۔ اُس کا خاوند ریاض ہی اسکی دُنیا تھی۔ وہی فرصت کے اوقات میں قسم قسم کی باتوں سے سمیرا کا دل بہلایا کرتا۔ محبت کی بھوکی سمیرا کے لئے اسکے خاوند کے دو میٹھے میٹھے بول ہی امرت رس کا کام دیتے۔ وہ مست ہو جاتی۔ وہ بے خودی میں دُنیا کو ایک عنبر سروری چیز سمجھنے لگ جاتی۔ اُسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ بہت دلکش ہے۔ وہ اپنے آپ کو ریاض کے دل و جان کی مالکہ تصور کرتی جیسا کہ ریاض اسکو بتاتا چلا آرہا تھا۔ محبت کا اعجاز تھا کہ وہ اپنے آپ کو وہی اٹھارہ سال کی رعنا لڑکی تصور کرتی تھی۔ کیونکہ ریاض کی فریبی باتیں اُس پر پوری طرح جادوگری کر چکی تھیں۔ وہ ہر وقت تصورات کی سنہری دھند میں کھوئی رہتی۔ وہ عالم خیال میں اپنے آپ کو اپنی جسم جوانی اور شرمیلے حسن کے عروج میں دیکھا کرتی۔ وہ دُنیا سے دُور ــــ ایک خوابوں کے جزیرے میں زندگی بسر کررہی تھی۔

مگر افسوس کہ حقیقت اس تمام تب و تاب کے برعکس تھی۔ اسکی آنکھیں تاریک ہو جانے کے بعد اس کی جوانی

ایک سرمائی سہ پہر کی مانند تھی جب شام زندگی بہت قریب ہوتی ہے۔ بے شک عنفوان شباب میں ایک
کلی کی مانند رعنا تھی مگر اب تو وہ ایک گلاب کا پھول تھی جس کی پتیاں رفتہ رفتہ گر کر سبزے سے
ہم آغوش ہو چکی ہوں۔ اور رہا سہا رس بھنورے چوس گئے ہوں۔

گہرے گڑھوں کی طرح تاریک چشمدان چاروں طرف سے جھریوں سے منقش تھے اور کالی لمبی زلفیں بھی
سیاہی کھو چکی تھیں۔ چہرہ زرد اور سوکھا ہوا دانتوں کی چمک مفقود اور سپیدی خون کی کمی کے باعث
زیادہ تر نیلاہٹ پر۔

ایک ایسا ڈھانچہ تھا جس پر مصنوعی کھال منڈھی گئی ہو۔ ایک بھیانک سا سایہ تھا جو جوانی کی
گزشتہ شادابی کا ماتم کرنے کے لئے باقی تھا ——— یہ سمیرا تھی۔

مگر وہ اس زعم میں کہ وہ خوبصورت اور جوان ہے کم سن لڑکیوں کی طرح ہلکے پھلکے اور چست لباس
زیب تن کیا کرتی۔ الہڑ لڑکیوں کی طرح معمولی معمولی سی آہٹ پر چونک چونک پڑتی۔ بالعض اوقات
البیلی ہرنیوں کی طرح سہم سہم جاتی جب وہ جنگل میں بے ہراس اچھلتے کودتے کوئی فوری خطرہ
پاتی ہیں۔ عمر کے لحاظ سے یہ سب عشوہ طرازیاں ایک بھونڈا مذاق تھا۔ مگر وہ بیقصور تھی۔ ایک
اکتا دینے والا دن رفتہ رفتہ شام کی طرف گھسٹ رہا تھا۔

سمیرا ایک آرام دہ مونڈھے پر گری ہوئی اونگھ رہی تھی۔ کمرے میں اور کوئی نہ تھا۔ فرش پر
دو چار الٹی سیدھی کرسیاں سمیرا کی تنہائی پر چپکے ہنس رہی تھیں۔ منظر بڑا اداس تھا۔

وہ دفعتاً چونکی۔ یہ بیٹھک میں کون ہے؟ یہ سرسر کی آواز کیسی ہے؟ ...... اوہ! —
وہ اچھل پڑی اور ہاتھ پھیلا کر ٹٹولتی ہوئی بیٹھک کی طرف بڑھی۔

"نیلوفر پیاری آہ! کسی طرح بھی اپنے جذبات کی ترجمانی نہیں کر سکتا ...... تم کیا ہو یہ میں
نہیں بتا سکتا۔ یہ کوئی بھی نہیں بتا سکتا ...... تم ایک رنگین تمنا کی طرح دلفریب ہو ......
تم سرما کی ابتدائی برف کیطرح لطیف اور دلکش ہو اور بہار کی سب سے پہلے کھلنے والی کلی کی طرح شوخ
و شنگ ...... پیاری تمہارے پسینے سے برساتی گھاس کی مہک آتی ہے۔ نشیلی اور مترنم آواز
...... تمہیں دیکھتے ہی مجھ پر موت کا سا نشہ طاری ہو جاتا ہے ...... تمہاری موجودگی میں میں
محسوس کرتا ہوں کہ کائنات میرے قدموں پہ جھک رہی ہے ......"

ایک لطیف قہقہے کی گونج ہوا کے تاروں کو تھرتھراتی رہی۔ "اوں چھوڑو بھی زیادہ نہ بناؤ
نہیں ہم سمجھتے ہیں کہ تمام مرد مکار ہوتے ہیں۔ کیا تم اپنی غریب بیوی کو دھوکا نہیں دیا کرتے

کہ تم اُسکے شوالۂ حسن کے پجاری ہو؟ کیا وہ اپنے سفید بالوں اور جھریوں سے مزین حسن کے باوجود یہ نہیں سمجھتی کہ تم اُس پر ہزار جان سے فریفتہ ہو؟ ...... آہ پیارے یہ سب محض لغو ہے۔"
مگر انہوں نے ایک سایہ دیوار کے ساتھ حرکت کرتا ہوا دیکھ لیا تھا۔
"آہ میرے ریاض"۔ ایک دلدوز چیخ اس طلسم کو درہم برہم کرتی ہوئی فضا میں بکھر گئی۔
اُس کا دل ٹوٹ گیا۔ ریت کا گھروندا گر چکا تھا۔ اُس نے ایک قدم لیا اور کمرے کے وسط میں لڑکھڑا کر گر پڑی۔
آنسوؤں کے دو پیازی رنگ کے قطرے صدیوں کی اداس گرد میں جذب ہو گئے۔ ایک نیا اُبھرا ہوا سینہ جلدی جلدی حرکت کر رہا تھا۔

(ترجمہ) {بشیر احمد خالد۔ سال سوم}

دُلھن کا خواب

رات کے دس بج چکے تھے اور اپنے باپ کے گھر میں اسکی آخری رات تھی۔ اُس کا باپ گاؤں کا پادری تھا۔ دوسری صبح اُس کی شادی گاؤں کے نوجوان سپاہی رچرڈ کے ساتھ ہونے والی تھی رچرڈ کا گھر اُن کے گھر سے تھوڑی دُور واقع تھا۔ درمیان صرف ایک سبزہ زار اور کچھ درخت تھے۔ اور دونوں مکان ایک دوسرے سے دیکھے جا سکتے تھے۔ الفرڈا بہت رات گئے تک جاگتی رہی موسم گرمی کا تھا اور کھڑکیوں سے پردے کھینچے گئے تھے۔ اُس کے سامنے میز پر رچرڈ کا بڑے سائز کا فوٹو تھا۔ اور وہ فوجی لباس میں بڑا خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ آخر کار نیند نے اُس کی آنکھوں کو گھیر لیا اور وہ سو گئی۔ باہر چاند چمک رہا تھا۔ چاندنی کی روشنی سے الفرڈا کا خوبصورت چہرہ اور بکھرے ہوئے بال اُس کے کمرے کو بقعۂ نور بنا رہے تھے۔
الفرڈا اچانک خوفزدہ ہو کر نیند سے بیدار ہوئی۔ اور رچرڈ کی تصویر کو سینے سے لگایا۔ وہ اُس کے شیشے کو چوم کر اپنے آپ سے یوں گویا ہوئی۔ "آج شادی سے پہلے آخری رات کو میری

بار پھر میں نے وُہی خواب دیکھا۔ اگر سچ مچ ایسا ہی ہوا.... اگر کوئی آخری لمحہ میں ہم کو جدا کرے...... لیکن نہیں ایسا نہیں ہو سکتا... یہ ناممکن ہے۔"

اُس نے گھڑی پر دیکھا۔ تین بج چکے تھے۔ اُس نے جلدی سے کچھ کپڑے پہن لئے۔ کھڑکی پر چڑھ کر درخت کی ایک شاخ سے لٹکی اور زمین پر آ پہنچی۔ اُس کے بال شاخ سے اُلجھ گئے لیکن اُس نے اُن کو جلدی سے چھڑایا اور سبزہ زار کے اُوپر سے دوڑنے لگی۔ وہ جلدی ہی رچرڈ کی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ ایک پھول توڑا اور رچرڈ کی کھڑکی سے کمرے میں پھینک دیا۔ رچرڈ کھڑکی سے نکلا۔ اور الفرڈا کو دیکھ کر کہنے لگا۔" الفرڈا.... تم اسوقت کیوں آئی؟" "رچرڈ مجھے اندر آنے دو۔" پہلے وہ جھجکا لیکن پھر ایک نچلی کھڑکی سے اُسکو اندر لے گیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور رچرڈ اُسکے پریشان بال سنبھالنے لگا۔

"رچرڈ! تین سال ہوئے میں نے پہلی دفعہ یہ خواب دیکھا تھا۔ ایک سال کے بعد پھر وُہی خواب دیکھا۔ اور آج تیسری دفعہ میں نے پھر وہی خواب دیکھا ہے۔" وہ بہت ڈر گئی تھی اور اُس کی صورت سے خوف و ہراس ٹپکتا تھا۔ "میں خواب میں دیکھتی ہوں کہ ایک تاریک گرجے میں میری شادی تم سے نہیں بلکہ ایک اجنبی سے کیجاتی ہے۔ میں نے اس آدمی کو کبھی پہلے نہیں دیکھا ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اور میری بالکل پرواہ نہیں کرتا۔"

رچرڈ نے اُسکو گلے سے لگایا پھر محبت آمیز الفاظ میں کہنے لگا۔" الفی تم ایک خواب سے اپنے آپکو اسقدر پریشان کیوں کر رہی ہو۔؟ آخر خواب کیا ہے ـــ ایک وہم ہے۔" "نہیں رچرڈ وہ ـــ خواب کا خاوند ـــ اسی طرح میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جس طرح تم ہو۔ وہ ایک لمبا، سنجیدہ انسان ہے۔ وہ میری قدر ایک کھلونے سے زیادہ نہیں کرتا۔ پھر آج کی رات یہ خواب میرے لئے یقیناً منحوس ہے۔" رچرڈ نے اُسے تسکین دی اور واپس گھر جانے پر آمادہ کیا۔ وہ دونوں سبزہ کے اُوپر سے چلے اور الفرڈا کے گھر تک پہنچے۔ الفرڈا پھر درخت کی شاخ سے کمرے کے اندر داخل ہوئی وہ مڑ کر رچرڈ کی طرف مسکرائی اور رچرڈ واپس چلا گیا۔

الفرڈا علے الصباح بستر سے اُٹھی۔ اُس کی ماں نے اُس کو دس بجے تک شادی کے لباس میں ملبوس کیا۔ مہمان آگئے اور وہ ایک مجمعے کے ساتھ گرجے کی طرف روانہ ہوئی۔ شادی کے لباس میں وہ بہت خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ کوئی شخص اُس کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ گرجے میں اُس نے اپنے آپکو اپنے پریمی کے پاس پایا اور شادی کی رسم شروع ہوگئی۔ اب اُس کے ہاتھ میں انگوٹھی پہنانے کی باری آئی

اُس موقعہ پر دونوں نے اپنی آنکھیں ملانے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ جونہی اُن کی آنکھیں دوچار ہوئیں الفرڈا کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی انگوٹھی بھی گر گئی جس کو بعد میں تلاش کر کے پا یا گیا۔ رچرڈ نے اسکو اپنی آغوش میں لیا اور سینے سے لگا یا۔ ایک ڈاکٹر کو تلاش کیا گیا۔ جس کے مشورے سے الفرڈا واپس گھر پہنچائی گئی۔ جب وہ ہوش میں آئی تو سب سے پہلے اُس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ انگلی خالی تھی وہ ابھی عورت نہ بنی تھی۔ اُس نے ایک سرد آہ بھری۔ چوبیس گھنٹے تک کسی نے اُس سے نہیں پوچھا۔ کہ معاملہ کیا تھا۔ اسکے بعد رچرڈ کو اُس کے پاس جانے کی اجازت دی گئی۔ اُس نے رچرڈ کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ لیکن خلاف توقع اُس سے بغلگیر نہ ہوئی۔ وہ پہلے ہی غم سے چور تھا۔ اب اُس پر بجلی سی گر گئی۔ الفرڈا نہایت افسردہ چہرے سے اسکی طرف دیکھتی رہی۔ رچرڈ رونے لگا۔ اور روکر یوں الفرڈا کو مخاطب کیا۔ "الفرڈا! پیاری الفی! میں نے کیا کہا ہے ؟ کیا تم کو مجھ سے ڈر لگتا ہے ؟ کیا تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تم کو دکھ دوں گا۔ یا کبھی تم سے بیوفائی کر سکتا ہوں ؟ تم میری آشا ہو کیا میں تمہارے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں ؟ بتاؤ کس چیز نے تمہیں اسقدر ڈرایا ہے ؟" الفرڈا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ "رچرڈ میں نے تم سے کل ہی کہہ دیا تھا کہ میرے تین دفعہ ایک ہی خواب دیکھنے کا ضرور کوئی مطلب ہے۔ جب میں نے تمہارے چہرے کی طرف آنکھیں اٹھائیں جیسا کہ ہم نے فیصلہ کیا تھا تو میری آنکھوں نے تم کو نہیں بلکہ اُسی خواب والے آدمی کو دیکھا۔ آہ رچرڈ میں کسطرح سے بیان کروں۔ ہاں وہی تھا۔ گرچہ میں کوئی دوسری چیز تبدیل نہ ہوئی تھی۔ میری آنکھوں نے تم کو ڈھونڈا لیکن تم کہیں نہ تھے۔" رچرڈ نے اسکو کہہ دیا کہ یہ محض اُس کا وہم تھا لیکن وہ کسی طور نہ مانی تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد رچرڈ نے کہا۔ "شادی کی تیاری اور شور و غل نے تمہارا دماغ پریشان کر دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب ہم کہیں خاموشی کے ساتھ شادی رچائینگے۔" "ایسے نہیں۔ اب نہیں ہو سکتا۔" وہ چلا کر کہنے لگی۔ "میں پھر تمہاری بجائے اُسی کو دیکھ لوں گی — ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔ بہتر ہے تم میرے خیال کیساتھ اتفاق کرو۔ ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔" "الفرڈا یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم ہوش میں نہیں ہو۔" رچرڈ سمجھا کہ الفرڈا بیمار ہے اسلئے وہ اچھی طرح سے اُس سے رخصت ہوا۔ اُس کے ماں باپ کو تمام معاملے کی اطلاع دی اور اُس امید میں گھر چلا گیا کہ ایک دو روز تک خود الفرڈا اُس کے پاس چلی آئیگی۔ لیکن نہیں ایسا نہیں ہوا۔ دو روز کے بعد اُس سے نہ رہا گیا اور وہ الفرڈا کے پاس آ گیا۔ الفرڈا نے پھر وہی جواب دیا۔ رچرڈ کہنے لگا۔ "الفرڈا! تم کو مجھ سے

محبت نہیں ہے۔" وہ زار زار روئی لیکن شادی کے معاملے پر کسی طرح رضامند نہ ہوئی۔ وہ ایک دل سوز منظر میں ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور ہمیشہ کے لئے الوداع کہی۔ اجرڈ اپنی رجمنٹ میں چلا گیا۔ ......

تین سال گذر گئے الفرڈا کا باپ لندن کا پادری بنا دیا گیا۔ اب وہ وہیں اپنے گھر بار سمیت چلا گیا۔ الفرڈا کی ماں مر گئی اور اس کی بہن نے شادی کی۔ اب وہ تنہا اپنے باپ کے ساتھ رہنے لگی۔ اسکو بہت دکھ ہوا۔ جب اس نے سنا کہ اجرڈ نے شادی کی اور ایک بچے کا باپ بھی بن گیا ہے۔

الفرڈا چھبیس برس کی ہوگئی۔ اور اس چھبیسویں سال اسکی عمر کا ایک بہت عجیب واقعہ ظہور رہوا۔ اب اس کا باپ ایک مشہور مبلغ بن چکا تھا۔ وہ ہر ماہ ایک دعوت دیتا جس پر الفرڈا صدر کے فرائض انجام دیتی۔ ایک رات جب وہ اور اس کا باپ مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ تو ایک آدمی جس کا نام مسٹر گرانٹ کہا گیا۔ اندر داخل ہوا۔ وہ درمیانی عمر کا تھا۔ وہ ایک اجنبی تھا اور دوسرے کی دعوت پر آیا تھا۔ جونہی الفرڈا کی نظر اس پر پڑی۔ وہ زرد ہوگئی اور بت کی طرح خاموش کھڑی رہی۔ اس کی یہ حالت دیکھکر وہ اجنبی اپنا تعارف کرانے کے لئے آگے بڑھا۔ لیکن الفرڈا نے ایک خفیف سی مسکراہٹ کے بعد کہا۔ "معاف کیجئے" اور وہ کمرہ چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ حیران ہوا اور سمجھا کہ اس نے کسی بے ادبی کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کے باپ نے اسے یہ کہہ کر بٹھوایا کہ "اسکی پروا نہ کیجئے۔ وہ بچپن میں خواب دیکھا کرتی تھی۔" الفرڈا حیران تھی۔ چھ برس کے بعد آج اس نے اپنے اس خواب کے خاوند کو زندہ اپنے پاس پایا تھا۔ گرانٹ الفرڈا کے سلوک پر حیران تھا۔ دعوت کے اختتام پر وہ الفرڈا کے پاس آیا۔ وہ بھاگنی ہی چاہتی تھی کہ گرانٹ بولا "معاف کیجئے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آج شام کے شروع میں مجھ سے کون سی ناخوشگوار حرکت سرزد ہوئی؟" "یہ بتانا ممکن نہیں ہے۔" "لیکن یہ ظلم ہوگا۔ آخر میں نے کیا کیا؟" "میں نے آپ کو اس سے پہلے کبھی دیکھا ہے" گرانٹ ذرا سی خاموشی کے بعد بولا۔ "ممکن ہے۔ کیونکہ میں جوانی میں آپ کے باپ کے گاؤں میں رہتا تھا۔ لیکن اسوقت آپ بچی ہونگی۔ اور میں نے کبھی آپ کو نہیں دیکھا ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کے دل میں میرے متعلق اسقدر برا خیال ہے۔ اسکو بھلا دیجئے۔" وہ چلا گیا۔ لیکن بہت بےچین کہ بات کیا تھی۔ لیکن کسی طرح کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ادھر الفرڈا کے دل پر بھی گرانٹ کا کافی اثر پڑا۔ اس نے محسوس کیا کہ گرانٹ اسقدر بدمزاج اور لاپرواہ نہیں جس قدر کہ اس نے اسکو خواب میں سمجھا تھا۔ اب اکثر دفعہ ان کی ملاقات ہوتی رہی اور وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے

لگے ۔ ایک دن وہ دونوں اکیلے سیر کو نکلے ۔ گرانٹ نے وہ راز معلوم کرنے کا یہ موقعہ مناسب جانا اور الفرڈا سے کہنے لگا ۔ " الفرڈا کیا تم مجھے کبھی نہ بتاؤ گی کہ پہلے روز میں نے آپ کو کیوں پریشان کیا تھا ۔" الفرڈا نے انکار کیا ۔ تو گرانٹ بولا ۔ " اگر میں آپ کا باپ ہوتا پھر بھی نہیں بتاتی ؟ " اُس نے نفی میں جواب دیا ۔ " اگر میں آپ کا بھائی ہوتا تو ؟ " " نہیں پھر بھی نہیں ۔" " اچھا اگر میں تمہارا خاوند ہوتا تو کیا پھر بھی نہ بتاتی ؟ " وہ تھوڑی دیر خاموش رہی ۔ پھر انکار کیا ۔ " ہرگز نہیں ۔ تمہاری خاموشی بتاتی ہے کہ ضرور بتاتی ۔ اسلئے مجھے یہ راز معلوم کرنے کے لئے ضرور تمہارا خاوند بننا چاہیئے ۔" اسکے جواب میں الفرڈا نے کہا ۔ " میری تو تین دفعہ آپ سے شادی ہو گئی ہے ۔" " اس کا کیا مطلب ہے ؟ " وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا ۔ الفرڈا نے تمام قصہ اسکو سنایا ۔ گرانٹ نے حیران ہو کر جواب دیا ۔ " کاش کہ تمام آدمی ہماری طرح نصیب والے ہوتے ۔ کس طرح خدا نے ہم دو کو ملایا ۔" ایکماہ میں اُن کی شادی ہو گئی ۔ اور وہ اچھی طرح زندگی گذارنے لگے ۔

پچیس برس کے بعد ایک روز گرانٹ بیمار ہوا ۔ اور موت سے ملاقات کی طیاری کرنے لگا ۔ بستر مرگ پر اُس نے الفرڈا سے کہا ۔ " الفی اگر مجھ سے ہو سکا ۔ تو ایک روز میں ضرور آپ کی ملاقات کیلئے آؤں گا ۔" وہ مر گیا ۔ الفرڈا اُسکے موت پر اسقدر غمگین نہ ہوئی جس قدر اُس نے خیال کیا تھا اُنکی جسمانی علیحدگی سے اُن کے روحوں میں کوئی علیحدگی نہ ہوئی ۔ اب اُس نے بالکل تنہا رہنے کا فیصلہ کرلیا ۔ ایک روز وہ ایک آبشار کے پاس درخت کے سائے میں بیٹھی ہوئی تھی ۔ دُور سے اُس نے ایک جوڑی کو اپنی طرف آتے دیکھا ۔ جب وہ اُس سے تھوڑی دُور کے فاصلے پر رہے تو اُس نے دیکھا ایک عمر رسیدہ آدمی جس کے منہ پر مونچھیں تھیں ایک نو عمر لڑکی کے بازو میں بازو ڈالے چل رہا تھا ۔ آدمی نے الفرڈا پر اپنی نظریں جمالیں ۔ الفرڈا کی عمر اسوقت ایسی نہ تھی کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف کشش کرے ۔ اسلئے اُس نے تعجب کیا ۔ جب وہ دونوں اُس کے پاس سے گذر گئے تو آدمی نے مڑ کر بھی الفرڈا کی طرف دیکھا ۔ تھوڑی دیر میں وہ دونوں واپس آگئے ۔ اب کے وہ اور زیادہ غور سے الفرڈا کی طرف دیکھتا رہا ۔ بلکہ آنکھ سے اشارہ بھی کیا ۔ الفرڈا کو برا محسوس ہوا اور وہ اٹھکر اپنے ہوٹل کی طرف چلی ۔ ابھی چند قدم ہی چلی تھی کہ وہ لڑکی اسکے پیچھے آئی اور یوں کہنے لگی ۔ " بیگم معاف کیجئے ۔ دادا جی معافی چاہتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آیا آپ بیگم گرانٹ ہیں ۔" الفرڈا نے کہا ۔ " ہاں ۔ کیوں میں نے کسی دوست کے پہچاننے میں غلطی کی ؟ " اب وہ آدمی بھی آگیا اور کہنے لگا ۔ " بیگم گرانٹ الفرڈا ۔ میں سمجھا ہی تھا کہ مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی ۔ آپ مجھے پہچانتی نہیں ہیں کیا ؟ " " کیوں

— آپ میجر ڈ ہیں — کرنل کولرین "؟ میجر ڈ کی بیوی مرچکی تھی۔ اب وہ اپنی عمر کی عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے موقعہ غنیمت جانا اور اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھا —
"کیول الفرڈا۔ بہتوں کے بچھڑے ایک نہ ایک دن ضرور ملتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" چند روز بعد اس نے اپنا مقصد الفرڈا پر ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "الفرڈا کیا اب تم وہ وعدہ پورا کرسکتی ہو جو تم نے ایک دفعہ تقریباً پورا کیا تھا۔؟ کیا اب بھی کوئی ہمارے درمیان حائل ہے؟" الفرڈا روئی۔ لیکن وہ اپنے خاوند کی محبت میں سچی رہی۔ اور انکار کیا۔
کچھ عرصہ کے بعد ایک رات وہ طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے دیر تک جاگتی رہی۔ اچانک گرانٹ داخل ہوا اور اس کو اپنے ساتھ لے گیا۔ صبح کو وہ اپنے کمرے میں مری ہوئی پائی گئی۔

(ترجمہ)

عبدالحمید سال سوم

راہزن

ہوا خاموش درختوں سے ٹکرا رہی تھی جہنا بحر بیکراں کی موجوں کے تلاطم میں ہچکولے کھانیوالی نیا کی طرح نظر آرہا تھا۔ اسکی مضطرب کرنیں راستے کی تاریکی کو منور کر رہی تھیں۔ ایسی سماں میں پہاڑی راہزن قرمزی رنگ کا چغہ زیب تن کئے، آہو کی کھال کا پانجامہ پہنے، فرانسیسی وضع کی ٹوپی سر پر رکھے، زنخداں سے ایک ریشمی گچھا آویزاں کئے ہوئے اور ایک لمبا بوٹ پہنے ہوئے اپنے اسپ باد رفتار پہ سوار ہو کر پرانی سرائے کی طرف آرہا تھا۔ پستول کے کندے اور تلوار کے دستے پر لگے ہوئے جواہرات چاند کی سیمیں روشنی میں جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔
گھوڑا اپنے سم پتھروں سے بجاتا اور آگ کی چنگاریاں پیدا کرتا ہوا سرائے کے احاطے میں داخل ہوا۔ شمعیں بجھ گئیں تھیں اور تمام سرائے تاریک لبادہ پہنے ہوئے نیند کی آغوش میں سوئی ہوئی تھی راہزن نے تمام جھلملوں کو یکے بعد دیگر کھٹکھٹایا اور تمام کو بند پاکر مطمئن ہوا۔ اس نے سریلی آواز میں ایک سیٹی بجائی کہ معاً پہلی منزل کی ایک کھڑکی آہستہ آہستہ کھلی۔ سرائے کے چودھری کی لڑکی بیس جس کو حسن عطا کرنے میں خدا نے بخل سے کام نہیں لیا تھا مسکراتی ہوئی کھڑکی کے قریب آئی۔ اس کے سیاہ لانبے لانبے بال ایک قرمزی رنگ کے فیتے سے بندھے ہوئے تھے۔
اصطبل کا دروازہ ہلکے ہلکے کھلا اور سائیس ٹام جس کے بیوقوف شرابی کی آنکھوں کے مانند سرخ

تھے اور جس کا چہرہ زرد اور مرجھایا ہوا تھا، آشفتہ مُو دروازے پر آگیا۔ ہبیس کا یہ خود غرض اور ننگِ عشق وفا عاشق (تمام) خاموشی کے ساتھ ان سچے پرستارانِ محبت کی الفت بھری باتیں سننے لگا۔

"میری پیاری دیوی! مجھے ایک بوسہ عطا کرکے اشیرباد دے میں ڈاکہ ڈالنے جا رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ پو پھٹنے سے قبل مال و دولت حاصل کرکے تیرے چرنوں میں حاضر ہو جاؤنگا۔ لیکن اگر میرا تعاقب کیا گیا تو رات کو چاندنی میں ضرور آ جاؤنگا۔ خواہ جہنم بھی منہ کھولکر میری راہ میں حائل کیوں نہ ہو" راہزن نے عقیدتمند پجاری کی مانند ہبیس کو مخاطب کرکے کہا۔ راہزن نے ہبیس کو چومنے کی بہت سعی کی لیکن بلندی مانع ہوئی۔ اس پر ہبیس نے کھڑکی سے سر جھکا کر اپنے لانبے لانبے بال نیچے لٹکا دیئے۔ راہزن نے انتہائی شوق و محبت سے اُن کو بوسہ دیا۔ اور پھر گھوڑے پر سوار ہوکر مغرب کی سمت روانہ ہوا۔

سورج نکل آیا اور مختلف منازل طے کرکے مغرب کی چوٹیوں میں روپوش ہوا لیکن ہبیس کا عاشق نہ آیا۔ شام کی تاریکی آہستہ آہستہ پھیل گئی اور سپاہیوں کا ایک دستہ سرائے میں گھس گیا۔ اُنہوں نے داخل ہوتے ہی کچھ کہے سنے بغیر ہبیس کا منہ بند کرکے اُس کو بستر کے ساتھ مضبوطی سے باندھا اور اپنی بندوقیں سنبھالے آنے والے راہزن کا انتظار کرنے لگے۔ سپاہی بے رحمانہ انداز میں ہبیس پر پھبتیاں اُڑانے لگے اور اُسے خوف زدہ کرنے کی غرض سے اُنہوں نے اُسکی پیٹھ کے ساتھ بندوق باندھ دی۔ "میں تیرے پاس رات کو چاندنی میں ضرور آ جاؤنگا خواہ جہنم بھی منہ کھول کر میری راہ میں حائل کیوں نہ ہو" راہزن کے اِن الفاظ کا تصور کرتے ہی ہبیس بلبلِ اسیر کی مانند تڑپنے لگی اور اُس کے بدن میں کپکپی سی پیدا ہوگئی۔ بے رحمانہ طریقے سے باندھے ہوئے ہاتھوں کو ہبیس نے نہایت جدوجہد اور جانفشانی کے ساتھ گرفت سے آزاد کرنا چاہا اور وہ آخرکار اپنا ہاتھ صرف بندوق کے گھوڑے تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئی۔ اُس کے ہاتھوں سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے لیکن وہ خاموش، ساکن اور مطمئن کھڑی رہی تاکہ سپاہی اُسکی چال سے واقف نہ ہو جائیں۔

چاند آسمان پر پوری آب و تاب کے ساتھ روشن تھا۔ اور راستہ اُسکی روشنی میں بلور کی طرح چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا معاً گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سڑک پر سے آنے لگی۔ آواز لمحہ بہ لمحہ تیز اور صاف ہوتی گئی۔ پہاڑی راستے سے راہزن پوری تیزی کیساتھ سرائے کی طرف آ رہا تھا۔ سپاہی چونک پڑے اور اُنہوں نے اپنی اپنی بندوقیں درست کیں۔ ہبیس خاموش کھڑی رہی۔ رات کی خاموشی میں گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز لحظہ بہ لحظہ نزدیک سے نزدیک تر آنے لگی۔ ہبیس کے چہرے سے ابدی روشنی نمایاں ہوئی اُس نے ایک دردناک آہ بھر کر بندوق کی لبلبی کو ہاتھ لگایا اور گولی میں

کے سینہ کو چیرتی ہوئی نکلی اُسکی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ راہزن نے جو آواز سُنی تو بغیر کچھ سوچے سمجھے تیزی سے واپس بھاگا۔

صبح جب مہرِ خاور اپنی درخشانی سے عالم کو بقعۂ نور بنانے لگا اور اُس کی شعاعیں شبنم کی باقی گذشتہ رات کا المناک اور دردناک حادثہ سن کر کانپ رہی تھیں راہزن کو بیس کے اچانک موت کی خبر ہوئی۔ جوشِ محبت سے پاگل ہو کر مہمل جملے بکتا ہوا اور تلوار گھماتا ہوا وہ پوری تیزی کیساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر سرائے کی سمت جا رہا تھا۔ آفتاب نصف النہار پر اپنی پوری تمازت اور تابش کے ساتھ چمک رہا تھا، راہزن ابھی سرائے کے بالکل نزدیک پہنچا تھا کہ سپاہیوں نے دیکھتے ہی اُس پر فائر کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا سڑک کے کنارے گرا اور گرتے ہی اپنی بیس سے جا ملا۔ اُس کے زنخداں کے نیچے ریشمی گچھا ابھی لہرا رہا تھا۔

کہتے ہیں اب بھی موسمِ سرما کی سرد راتوں میں جب ہوا درختوں سے ٹکرا کر سائیں سائیں کی آواز پیدا کرتی ہے اور جب مہتاب کی شعاعیں درختوں کو چیرتی ہوئی سینۂ گیتی کو منور کرتی ہیں، پہاڑی راہزن اپنے اسپ باد رفتار پر سوار ہو کر سرائے کے دروازے پر پہنچتا ہے۔ اور چابک سے جھلملوں کو کھٹکھٹا کر ایک سیٹی نہایت ہی سُریلی آواز میں بجاتا ہے اور بیس قرمزی رنگ کے فیتے سے بندھی ہوئی زلفوں کو پریشان کر کے کھڑکی سے اُس کی طرف مُسکرانی لیکن للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔

ترجمہ نظم انگریزی (The Highway man)

(از محمد حُسین سُہیل کشمیری۔ ایف۔اے سٹوڈنٹ)

سُرودِ دہقاں

زمانۂ قدیم کی کشمیری شاعری میں قصّے اور کہانیوں کو نظم کرنے کا عام رواج تھا۔ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان کی شاعری میں بھی انقلاب آگیا اور قصہ کہانیوں کی جگہ عشقیہ غزلیں رائج ہوگئیں۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ گذشتہ زمانے میں عشقیہ شاعری نہ تھی۔ تھی لیکن ساتھ ساتھ افسانہ کی چاشنی ضرور ہوا کرتی۔

قدیم کشمیری شاعروں کے ہاں وزن کی کوئی خاص پابندی نہ تھی، جس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ قدیم

شاعر علمِ عروض سے ناواقف تھے اور وہ جو کچھ کہتے تھے اپنے وجدانی کیف اور عالمِ مستی میں کہتے تھے۔

'لولو' کے الفاظ کشمیری زبان کی اکثر نظموں میں بطور ردیف کے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اُستاد براؤن کیمبرج یونیورسٹی میں علوم شرقیہ کے پروفیسر تھے اپنی کتاب موسوم بہ "پوئیٹری آف پرشیا" Poetry of Persia میں لکھتے ہیں کہ 'لولو' اصل میں پرانی فارسی یعنی پہلوی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس کے معنی Song of Reapers کے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مثال کے طور پر چند نظموں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہ الفاظ پہلوی زبان سے کشمیری زبان میں آ گئے ہیں۔

زمانۂ قدیم کی نظموں میں جو قصے کہانیاں بیان کی جاتی تھیں وہ زیادہ تر نبیوں اور اولیاؤں کے چھوٹے چھوٹے قصوں سے متعلق ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے عشقیہ افسانے بھی لکھے جاتے تھے ان افسانوں یا قصوں کو اگر ہم Short stories کہیں تو بہتر ہوگا۔ عشقیہ مضامین پر مشتمل جو لمبی لمبی کہانیاں ہوتی تھیں۔ انہیں مثنوی کی صورت میں بیان کیا جاتا تھا۔ اور جس طرح پنجابی زبان میں سیف الملوک، سوہنی مہینوال، پنوں، ہیر رانجھا وغیرہ مثنویاں مشہور ہیں اسی طرح کشمیری زبان میں گلریز، ممتاز بینظیر، گلدستۂ بے نظیر، زہرہ و بہرام اور دیگر قصے لافانی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

کشمیری زبان کے اکثر قدیمی گیت دیہات میں ہی رائج ہیں۔ اگرچہ زبان میں اب بہت کچھ تبدیلی ہوئی ہے لیکن کشمیری ساز میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ دیہات میں ابھی وہی دقیانوسی ساز رائج ہے اگرچہ شہروں میں تہذیب نو کے زیرِ اثر ساز میں بھی تبدیلی ہوئی اور ہارمونیم، طبلہ، بم وغیرہ ساز رائج ہوئے لیکن کشمیر کے دور دراز گاؤں میں ابھی وہی پرانا ساز ہے جو کتب ریشی کے وقت سے برابر چلا آتا ہے۔ گیت جو حقیقت میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں اور قدیم کشمیری شاعروں کی عرق ریزی کا نتیجہ ہیں دیہات ہی میں مقبول ہیں کیونکہ شہروں میں اب عشقیہ، اخلاقی اور سیاسی غزلیات رائج ہیں جو موجودہ وقت میں خصوصاً حضرت مہجور کی قلمی کاوشوں کی بدولت مقبول ہیں۔

یہاں چند کشمیری گیتوں کا ترجمہ پیش کر کے پرانے زمانے کی کشمیری شاعری کو ذرا سا بے نقاب کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔ ترجمہ پیش کرنے سے پہلے یہ بات عرض کرنی ضروری ہے کہ قدیم شعرا تقریباً تمام کے تمام مسلمان تھے اور چونکہ وہ رند اور صوفی گذرے ہیں۔ اسلئے انہوں نے صرف مسلمانوں کے نبیوں اور اولیاؤں کے قصوں ہی کو نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ایک کشمیری شاعر نے ایک

چھوٹی سی کہانی بیان کی ہے جس کا ترجمہ اُردو میں یوں ہوسکتا ہے۔ ترجمہ :-

" ایکدن مچھروں کی ایک جماعت نے آپس میں مشورہ کرکے حضرت سلیمانؑ کے پاس یہ فریاد کی۔ کہ ہوا غذا حاصل کرنے میں ہمارے لئے روکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ حضرت سلیمان نے ہوا کو حاضر ہونے کا حکم دیدیا۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ ابھی ہوا کا ایک ہی جھونکا حاضر ہوا تھا کہ تمام مچھر ہوا ہوگئے۔" اس چھوٹی سی کہانی کو یہ شاعر کشمیری زبان میں یوں بیان کرتا ہے ؎

آسمانس پیٹھ آس کران کُنہ جما عتاہ مشورہ آس کران گژھو پیٹھ پادشاہ
عرض کرہ ہوس اے پادشاہ واو نہز اسہ کھنہ دیوان غذا
پادشاہن نا وآسو سُلیمان شاہ حکم کُرن واوس جل یہ پیش پادشاہ
واوُ تولُن مہہ تر ایہ ترِجھین نے لولو . . . .

خواجہ احمد بٹواری نے جو کشمیری زبان کے مشہور شاعروں میں سے ہوئے ہیں ایک نظم لکھی ہے۔ جو خوفِ طوالت کے باعث میں قلم انداز کرتا ہوں صرف ترجمہ ہی لکھ دیتا ہوں۔

" خداوند تعالیٰ نے اپنی قدرت کے کمال سے ایک جنگل میں ایک ہرنی پیدا کی۔ اور اسکی زندگی کے تمام سامان بھی اُسی جنگل میں پیدا کئے۔ قضا سے ایکدن ہرنی کو پیاس لگی، پیاس کی شدت سے بے تاب ہوکر ہرنی ادھر اُدھر قلانچیں بھرنے لگی۔ اُس کا گذر عرب کے ایک باغ سے ہوا جس کے اندر آبِ مصفا کا ایک چشمہ تھا۔ ہرنی اندر داخل ہوئی اور چشمے کے قریب آکر پانی پینا شروع ہی کیا تھا۔ کہ یہودی نے جو باغ کا مالی تھا اُسے کمند میں پھنسا لیا۔ اتفاقاً حضرت محمدؐ صاحب کا گذر اُدھر سے ہوا ہرنی نے شفاعت کے لئے فریاد کی۔ آنحضرتؐ اندر داخل ہوئے تو ہرنی بولی " یا حضرت میں پھر واپس آجاؤنگی صرف مجھے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو آخری دفعہ دودھ پلانے کی اجازت دیجئے! " آنحضرتؐ نے اُسے ڈھائی گھنٹے کے اندر اندر واپس آنے کے لئے فرمایا اور یہودی کے کہنے کے مطابق خود ہرنی کیلئے ضامن ہوئے۔ ہرنی چلی گئی اور اپنے بچوں کے پاس پہنچکر انہیں تمام واقعہ سنایا اُنہوں نے دُودھ پینے سے انکار کیا اور بولے کہ جب تک ہم بھی آنحضرتؐ کی زیارت نہ کریں گے تمہارا دُودھ ہم پر حرام ہے۔ ہرنی معہ اپنے بچوں کے صرف ڈیڑھ ہی گھنٹے میں لوٹ آئی۔ یہ دیکھکر یہودی کا دل موم ہوا اور اُسکی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُس نے حضرت سے معذرت چاہی اور اپنے اہل وعیال سمیت اسلام قبول کیا۔"

یہی صاحب بنسری کی کہانی اُسی کی زبانی یوں کہتے ہیں۔

"میں دور جنگل میں ایک سرسبز دیار تھی وہاں لکڑ ہارے سے بچ نہ سکی۔ اس نے مجھے کاٹ کر نیچے زمین پر گرا دیا۔ میرے جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹوٹے بنا کر مجھے پانی میں بہا دیا۔ پھر مدت تک پتھروں اور سخت زمین کے ساتھ ٹکراتی ہوئی ایکدن میں نے اپنے آپ کو کنارے پر پایا۔ چند لمحوں کے بعد ایک بڑھئی میرے جسم کو بڑی بے دردی کیساتھ چیرنے لگا۔ اس نے میرے جسم میں سات سوراخ کر کے مجھے بنسری کی صورت میں تبدیل کیا۔"

ایک شہزادے کو ایک شہزادی سے محبت ہوئی وہ بڑی مصیبتیں برداشت کر کے معشوقہ کے شہر میں پہونچا۔ اور اپنے طوطے کو قاصد بناکر شہزادی کے پاس بھیجا۔ اسوقت شہزادی جانوروں کو دانہ کھلا رہی تھی۔ لیکن یہ طوطا بالکل دانے کے پاس نہ آیا۔ شہزادی بولی۔

اُمہ حورہ کر تکرار ڈیر چھو جانا دار
پھل چھو نہ کھون سَن قبول گژہو تھاؤن

ترجمہ:۔ اس حور پیکر نے کہا کہ جانور غیر معلوم ہوتا ہے ہمارا دانہ نہیں کھاتا کاش یہ (ہمارا دانہ) قبول کرتا۔

طوطا بولا۔ طوطن وَنونس باز کیاہ کھمہ ہوگژ ناس
گوڈہ کھتہ کینژاہ سون قبول گژہو تھاؤن

ترجمہ:۔ طوطا بولا میں کیا زہر کھاؤں جبکہ تم کوئی ہماری چیز نہ کھاؤ۔ شہزادی بولی "اچھا لے آؤ جو کچھ تو لانا چاہتا ہے"۔ طوطا شہزادے کی طرف سے کھجوروں کی ایک مالا بطور تحفہ کے لاتا ہے۔

طوطن اُمژ ڈ ال خضر مالاہ نال
اُمہ حورہ ہتو باگرون قبول گژہو تھاؤن

اس حور پیکر نے کھجوریں حاضرین میں تقسیم کیں

حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جو سلوک اُنکے سوتیلے بھائیوں نے کیا وہ واقعہ ایک کشمیری شاعر یوں بیان کرتا ہے۔

ترجمہ:۔ سوتیلے بے رحم بھائیوں نے حضرت یوسف کو خار دار میدان میں ننگے پیر چلایا اور پھر ایک کنوئیں میں ڈالدیا۔ ایکدن ایک کاروان کا گذر اس طرف سے ہوا اُن کے مالک نے چاہ سے پانی نکالنے کا حکم دیا۔ اسکے بعد جو وقوع میں آیا شاعر یوں بیان کرتا ہے۔ "تکہ لو یکہ آب کھالکھ + کھنو یوسف گاہ تراوان + خوجس نو مال یاد رودؤ"

ترجمہ:۔ "انہوں نے پانی میں ڈول ڈالدیا اور حضرت یوسف آفتاب کیطرح چمکتے ہوئے باہر نکل آئے اُنہیں دیکھکر سوداگر اپنا مال بھی بھول بیٹھا"

خوف طوالت کے باعث اس صحبت میں اسی مختصر مضمون پر اکتفا کی جاتی ہے۔ (از محمد حسین سہیل کشمیری۔ الیف۔ اے سٹوڈنٹ)

'انوکھا سوال'

ہوا نے ڈیک کے گرد مسرت بھرا ماحول پیدا کیا ہوا تھا۔ جہاز سراپا ناز دُلھن کی طرح اٹھکیلیاں کرتا ہوا جا رہا تھا۔ بے پناہ سمندر عجیب اور دلکش سماں پیش کر رہا تھا۔ دور سمندر کی سطح اور اُفق ہم کنار ہو رہے تھے۔ اس رنگین منظر میں کتنی دلفریب جاذبیت پنہاں تھی۔ آفتاب شب فراق سے بچنے کیلئے کبھی کا غائب مغرب کیطرف جا چکا تھا۔ ہوا لخلخہ آمیز تھی۔ جو لپٹ آتی۔ روضہ رضواں کی خبر لاتی۔ اسوقت ڈیک پر دو متنفس تھے۔ ایک رعنا جوان اور ایک نازک حسینہ۔ جو چند ہی دنوں کے شادی شدہ تھے۔ اُن کا ماہ عروسی منانے کی خاطر کسی اچھے مقام پر اُترنے کا ارادہ تھا۔ دونوں معصومیت کے مجسّمے تھے۔ مرد فوجی زندگی کی سختیوں کو خیرباد کہہ کر اور بیوی الھڑپن کی شوخیوں کو الوداع کہہ کر ایک حسین رشتہ میں منسلک ہوئے تھے۔ ڈیک پر موجودہ خوش کُن لمحات اور آئندہ کی پُرامید زندگی کا تصوّر اُنہیں مسرور کر رہا تھا۔ اسوقت خاوند کی بیتاب نظریں اُسکے ننھے ننھے پاؤں کا مشاہدہ کرتیں۔ آہا۔ کتنے خوبصورت پاؤں ہیں۔ وہ گول گول ایڑیاں اور پیازی ناخن۔ انگور کی بیل کی طرح رس بھری سڈول باہیں اور ان میں نیلی نیلی رگیں۔ کتابی چہرے کی مسحور کُن دلکشی اور سراپا حسن کے شوخ نمونے کو دیکھکر خاوند کی نظریں حیرت سے کھلی رہ جاتیں۔ وہ...... اسقدر حسین تھی۔ حسینہ کا مطمئن دل سمندر کی نیلی شام سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ فضا ایک حسین مریضہ کی طرح مضمحل نظر آ رہی تھی۔ کتنا ہی اچھا نظارہ تھا۔ فطرت کی یہ جاذب نگاہ سادگی بہت ہی دلپسند تھی۔ لیکن فوجی کا دل نامعلوم کیوں مضطرب تھا۔ اس کی نگاہیں کبھی اُفق کیطرف اور کبھی اپنی محبوبہ کیطرف اُٹھتیں۔ اس کا دل عورت کے ایک انوکھے راز کو معلوم کرنے کے لئے لمحہ بہ لمحہ بے قرار ہوا جا رہا تھا۔ وہ غلط فہمی کے بے پایاں بحر میں غوطہ زن تھا۔ وہ اپنی بیوی سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ حلق میں ہی اٹک جاتے۔ اس کی نگاہیں بار بار عورت کے سینے کی طرف اٹھتیں۔ جیسے اس سنگین دیوار کو منہدم کر کے راز بے نقاب کر کے ہی دم لینگی۔ بیوی اس کی طویل خاموشی چہرے کے آثار چڑھاؤ اور دل کی تیز حرکت کو دیکھکر جب بھانپ گئی۔ کہ خاوند پریشان ہے۔ تو محبت آمیز لہجے میں پوچھا۔ "آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ چلئے اندر چلیں۔" "میں تو اچھا ہوں"۔ خاوند نے جیسے کسی گہرے خواب سے بیدار ہوتے ہوئے جواب دیا۔ اور سنبھل کر کہا۔ "میری اچھی بیوی......

لیکن ..... مگر ..... کچھ بھی نہیں "۔ "مگر! لیکن کیا؟ کہئے میرے محبوب"۔ عورت نے اس انداز سے کہا۔ جیسے کسی تجربہ کار کی انگلیوں نے آرگن کے تاروں کو چھیڑا ہو۔ اسکی آواز ایک تڑپانے والا نغمہ ایک پرکیف ساز اور مدہوش کر دینے والی موسیقی تھی۔ جس سے خاوند پرستی سی طاری ہو رہی تھی لیکن اس نے پھر سنبھل کر کہا۔ "یونہی .... لیکن ...... ہاں۔ ایک بات کا جواب دوگی؟" ۔
"کہئے۔ شوق سے پوچھئے۔ سب میرا آپ سے چھپا ہی کیا ہے۔" بیوی نے اپنی مخمور آنکھوں کو نیم وا کرتے ہوئے اور سبزے کی طرح بل کھاتے ہوئے کہا۔
"کیا تم نے مجھ سے پہلے کسی سے محبت کی ہے؟" خاوند نے کچھ وقفہ کے بعد رک رک کر پوچھا اور ایک آہ بھری۔ جیسے دل پر سے بوجھل پتھر ہٹا لیا گیا ہو۔
رات کی سنسان تاریکی دنیا پر سیاہ نقاب ڈال چکی تھی۔ رات کا سہانا وقت تھا اور چاند کی روپہلی بارش۔ سمندر کی ٹھنڈی ہوا دیوانہ وار نئی نویلی دلہن کے گیسوئے عنبریں سے ٹکرا رہی تھی۔ ہر طرف کا مل سکوت تھا۔ شکی شوہر کا زرد اور نیک بیوی کا شوخی بھرا چہرہ نمایاں تھے۔ دونوں چپ تھے۔ جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ خاوند نے دماغی ہیجان کو ضبط نہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "میرے سر کی قسم۔ جلدی جواب دو"۔ بیوی ہنس پڑی۔ جیسے ٹھیک ایک پھولوں کی کیاری تھی اور اسمیں ایک معصوم کلی رات کے وقت چاند کی روپہلی گرمی کی تاب نہ لاکر کھل پڑی ہو۔ اس نے جواب دیا۔
"بس۔ یہی تھا آپ کا لاینحل سوال؟ جس نے آپ کی حالت کو اتنا متغیر کیا۔" پھر کچھ رد ھکر اس نے اپنے خاوند سے الٹا یہی سوال کیا۔ جس نے اپنی نفسانی خواہشات پر قادر ہونے کا فخریہ اظہار کرکے اس سے اپنے سوال کا جواب دینے کے لئے اصرار کیا۔ اب حسینہ کے لئے جواب دئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا وہ بے باکانہ انداز سے بول اٹھی۔ "خیر۔ جب آپ اتنے مصر ہیں تو سنئے۔ ہاں ایک شخص نے مجھ سے محبت کی ہے۔"
خاوند کا چہرہ اتر گیا۔ جیسے کسی فولادی ہاتھ نے اسے ایک گھونسا رسید کیا ہو۔ اور جیسے اسکی تمنا تشنہ تکمیل رہ گئی ہو۔ وہ یاس وحسرت کی تصویر بن گیا۔ مرجھائے ہوئے پھول کیطرح ہارے ہوئے جواری کی مت یہ اور بےبس و مرام ڈاکو کی مانند درد وکرب سے تلملا اٹھا۔ لیکن بیوی اسطرح ہنس رہی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اور اسکی ہنسی خاوند کو ایسی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے مرگھٹ پر چاند چمک رہا ہو۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے قلب مضطرب کو تھامے ہوئے بولا "افسوس! میں نے فوجی زندگی کتنی پاکبازی سے گزاری۔ جیسے میں کپتان نہ تھا۔ بلکہ راہب۔ آج میرے اس دل کو

چھوٹ گئی۔ جسے میں نے بڑی بڑی امیدوں کا آماجگاہ بنایا تھا۔ میری بستی اجڑ گئی۔ متاعِ زندگی لٹ گیا۔ اور وہ بھی کس المیہ اختتام کے ساتھ۔ اب ایک بھکاری کی طرح تم سے یہ سوال کرتا ہوں۔ کہ وہ خوش نصیب کون تھا؟۔ کیا وہ سارا واقعہ اختصار کے ساتھ سنانے کی تکلیف گوارا کرو گی؟" وہ کانپ رہا تھا۔ جیسے آسمان پر ستارے لرز رہے ہوں۔ وہ سرد آہیں بھر رہا تھا جیسے سمندر سے بھاپ اٹھ رہا ہو۔ وہ سر ٹکراتا تھا۔ جیسے موجیں کنارے سے ٹکراتی ہوں۔ لیکن اس پر بھی وہ حسین ساحرہ ہنس رہی تھی۔ آخر اس نے خاوند کے اصرار پر یہ کہا۔

"ایک شام کو جب میں اپنے باغ کے ایک گوشے میں بیٹھی تھی پیچھے سے کسی نے میرا نام لیکر پکارا۔ وہ کون تھا؟ میں حیران تھی۔ لیکن یہ سراسیمگی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ وہ سامنے آیا۔ آہ! کتنا خوبصورت تھا وہ۔ مردانہ حسن کا اچھوتا نمونہ۔ سچ مچ محبت کرنے کے قابل۔ میری خیر و عافیت پوچھنے کے بعد اس نے میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور پھر اٹھا کر گلے لگائے ہوئے مسلسل بوسے لینے شروع کئے۔"

"گلے لگائے رہا! بوسے لئے! بے شرم۔ حسین ناگن۔ اوباش کیا تمہیں معلوم نہ تھا۔ کہ تم اسوقت ایک غیر مرد کے پہلو میں تھی۔ کیا تم صرف اوروں کو ڈسنا جانتی ہو۔ اور اپنے ڈسنے کے علاج سے بے خبر۔ کیا تم شمع کی طرح پروانے کو مٹانے کی فکر میں ہو۔ اور اپنے بجھ جانے سے لاعلم۔ حیف ہے تجھ پر۔ مردوں کا یہ شکوہ صحیح ہے۔ کہ صنف نازک ناقابل اعتبار رہے۔" خاوند نے کہا۔ جواب ایک بجھے ہوئے چراغ اور روندے ہوئے پھول کی مانند تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا اور آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اس کے ٹوٹے ہوئے دل میں اگر کچھ اور باقی تھا تو وہ عورت کے خلاف نفرت تھی۔ اپنی جس بیوی کے ساتھ کچھ ہی گھڑیاں پہلے مجنون اور کوہکن بنا بیٹھا تھا۔ اس کی محبت نفرت میں تبدیل ہوگئی۔ اور اس نے بیوی کے حسین چہرے پر اب بھی مسکراہٹ مفقود نہ تھی۔ کہا۔ "اس سے پہلے کہ میں تمہیں طلاق کی خبر سنا دوں کیا میں پرانی محبت اور پرانے رشتہ کے طفیل پوچھ سکتا ہوں۔ کہ تم جیسی شریف جنس کو اپنے کھو دینے میں ایک غیر مرد کے ساتھ معانقہ کرتے شرم نہیں آئی؟۔ تمہاری نسوانیت کو کیا ہوا تھا؟۔ کیا تمہیں عورت کے تقدس کی توہین کا خوف نہ آیا؟۔ صنف نازک اپنے عصمت کے شیشے کی نزاکت کو خوب جانتی ہے۔ لیکن کیا تمہیں اس کا ذرا بھی احساس نہ ہوا؟ کیا تم سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ کہ گلے سے باہیں چھڑا کر بھاگ جاتیں؟"

"بھلا کیسے۔ میں بھاگ کیسے سکتی تھی؟"

"کیوں۔" خاوند نے بیقرار ہو کر پوچھا۔

"میں اُس وقت صرف چھ سال کی بچی تھی۔ اور مجھے یہ معلوم تھا کہ میں اپنے مہربان چچا کی گود میں ہوں۔ جو میری زندگی بھر پہلی دفعہ مجھے ملنے آیا تھا۔ اور پھر میں اُس جیسے سیم اور جسیم جوان کی گرفت سے کیسے آزاد ہو سکتی ؟"

خاوند کا چہرہ سُرخ ہو اُٹھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اُس کے مردہ جسم میں نئی روح پھونک دی گئی ہو۔ اُس کی حسرت عود کر آئی۔ اور فرط انبساط سے اپنی حسین بیوی کو سینے سے لگا کر باہوں میں بھینچ لیا۔ اور بولا "میری با مذاق بیوی! تمہارا مذاق کتنا دہشت ناک تھا"

بیوی نے گرمجوشی سے اپنے ہونٹوں سے خاوند کے چہرے پر ابدی محبت کی مہر ثبت کرنے میں کوتاہی نہ کی اور بول اُٹھی۔ "میرے تنگدل محبوب! آپ کی تنگدلی بھی کتنی خوفناک ہے"

بادل ہٹ گئے۔ چاند نے رات کی سیاہ چادر سے سر نکال کر جھانکا۔ دو قالب یک جان جوڑی کو دیکھ کر فوجی کپتان کی پیاری محبوبہ کے حُسن کو نکھار دیا۔ دلفریب چاندنی رات ...... رومان بھرے دل ...... اور سکوت۔

(ترجمہ) کے۔ این۔ ایما کنوِل

سال سوم

غریب کا دل

وہ غریب جو افلاس میں زندگی گذارتے ہیں جو فاقہ کشی کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے دل امیروں سے زیادہ وسیع ہوتے ہیں۔ ذیل کا افسانہ ایک ماہی گیر کی کہانی ہے جو حُسن و عشق کے ہیولا ن سے خالی ہونے کے باوجود بے حد دل گداز ہے۔

رات ہو چکی تھی، شفق کی لطیف زایل شدہ روشنی جھونپڑی کے ایک حصہ پر پڑ رہی تھی۔ تاریکی میں رکھی ہوئی اشیاء آتشدان کے ٹمٹماتے ہوئے انگاروں کی روشنی میں بمشکل نظر آتی تھیں۔ دیوار پر ماہی گیر کے جال لٹکے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں الماری پر روزانہ استعمال کے چند برتن مشعلوں کی کانپتی ہوئی روشنی میں جھلملا رہے تھے۔ مسہری کے علاوہ جس پر پردے پڑے تھے۔ ایک طرف پُرانے تختہ پر ایک چٹائی بچھی تھی۔ اس پر پانچ چھوٹے چھوٹے بچے گھونسلے میں پڑے ہوئے چڑیا کے بچوں کی طرح محو خواب تھے

سامنے بچوں کی ہتھیلی پر سر ٹیکے دو زانو بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت تنہا تھی۔ جھونپڑی کے باہر سیاہ سمندر جھاگ کی لہروں سے رو رو کر سرگوشیاں کر رہا تھا۔ اس کا شوہر اس بے پایاں سمندر میں شکار کیا گیا تھا۔

وہ بہت چھوٹی عمر سے ماہی گیری کرتا تھا۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ ہمیشہ ہی سمندر وں سے آمادہ پیکار رہا۔ کیونکہ اس سے اپنے بچوں کا پیٹ پالنا تھا۔ طوفان، بارش، ہوا اور اولوں کا مقابلہ کرنا اس کا روزانہ مشغلہ بن گیا تھا۔ جب وہ اپنی چار بادبانوں والی کشتی میں سوار اپنے فرض کے انجام دینے میں مشغول ہوتا تو اسکی بیوی گھر بیٹھی پھٹے ہوئے بادبانوں میں ٹانکے لگایا کرتی۔ جال بنتی یا انگیٹھی پر چڑھے ہوئے مچھلی کے شوربے کو دیکھتی کہ کہیں اُبل نہ جائے۔

اپنے بچوں کو سُلا کر اُس نے موجوں اور تاریکی کے مقابلے میں اپنے شوہر کی سلامتی کے لئے دُعا کی۔ یہ حقیقت ہے کہ ماہی گیر نہایت خطرناک زندگی گذارتے ہیں۔ مچھلی کا بہتر شکار متلاطم سمندر کے ایک خاص ٹکڑے میں ہی ہوسکتا ہے۔ وسیع سمندر غیر یقینی مخدوش۔ اور متبدل حصہ جاڑے کی سرد راتوں میں آندھی طوفان اور کہر کے باوجود اپنے اور بال بچوں کے پیٹ کے لئے شکار کرنا پڑتا۔ آج بھی ماہی گیر ہدفِ مصائب بنا ہوا تھا۔ اس وقت بھی جبکہ موجیں زمردی سانپوں کی طرح لہرا رہی تھیں تاریکی سی لئے کنار خلیج گہرے سانس لے رہی تھی۔ کشتی کے بادبان خوف سے کانپ کانپ چیخ اُٹھتے تھے۔ اُس کے دل سے اپنی بیوی کا خیال محو نہ ہوتا تھا۔ اور اسکی بیوی جھونپڑے میں بیٹھی پُرنم آنکھوں سے اُسے یاد کر رہی تھی۔

وہ اپنے شوہر کے لئے دُعائیں کر رہی تھی کہ کسی دریائی جانور کی کرخت آواز نے اُسے خوفزدہ کر دیا۔ اور چٹانوں سے ٹکرانے والی موج کی گرج سے اُس کی روح تک کانپ گئی۔ وہ خیالات میں محو اپنی غربت کے خیالات میں اس کے ننھے ننھے بچے گرمی، سردی اور برسات میں ننگے پیر پھرتے گیہوں کی جگہ جو کی روٹی بھی انہیں نصیب نہ ہوتی تھی۔ اُف! سمندر بھوکے شیر کی طرح غرّاتا تھا۔ اور ساحل پر اس کی آواز ہتھوڑے کی چوٹ کی طرح گونج رہی تھی۔ کس قدر بدنصیب ہوتی ہیں ماہی گیروں کی بیویاں! کس دل سے وہ کہہ سکتی ہونگی کہ ہمارے پیارے باپ، عزیز، بھائی اور بیٹے طوفانی سمندر میں ہیں لیکن وہ سب سے زیادہ بدنصیب تھی کیونکہ اس کا شوہر تھا۔ اس مہیب رات میں تنہا تھا۔ اس کے بچے ابھی باپ کا ساتھ دینے کے قابل نہ تھے۔ غریب ماں اس وقت وہ کتنے ارمانوں کیساتھ کہتی ہے کہ وہ جلد جلد بڑھیں تاکہ بڑے ہوکر اپنے باپ کا

بنائیں لیکن یہ اسکی کیسی بھولی منت ہے۔ چند سال بعد جب اس کے بچے سچ مچ جنگ میں مصروف ہو گئے۔ تو کیا اسوقت یہی ماں پُرنم آنکھوں سے نہ کہیگی کہ کاش میرے بچے ابھی بھی بچے ہی ہوتے!

ماہی گیر کی بیوی لالٹین لیکر جھونپڑی سے باہر آئی۔ "ان کے آنے کا وقت ہوچکا ہے!" اس نے سوچا۔ "دیکھوں تو سہی طغیانی کم ہوئی اور روشنی کا مینار روشن ہے کہ نہیں"۔ فضا بالکل تاریک تھی۔ افق پر معمولی سی سفیدی نظر آرہی تھی۔ بارش زوروں پر تھی۔ صبح کاذب کی سرد اور باریک بارش! آس پاس کے تمام جھونپڑیوں کے روشندان اور کھڑکیاں تاریک تھیں۔ مہیب اندھیرے میں ادھر ادھر بغور دیکھنے سے ایک پرانی جھونپڑی کا نقشہ سا نظر آیا۔ اس میں کسی قسم کی روشنی نہ تھی اور نہ ہی آگ روشن تھی۔ ربند دروازہ ہوا میں جھول رہا تھا۔ کہنہ دیواریں بمشکل متزلزل چھت کے بوجھ کو سنبھالے کھڑی تھیں۔

"اوہ"! اس نے کہا۔ "میں اس غریب اور بیمار بیوہ کو بھول ہی گئی تھی۔ کل انہوں نے اسے نہایت خستہ حالت میں دیکھا نہ جانے اب وہ کیسی ہے"۔ جھونپڑے کے دروازے پر پہونچکر دستک دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ساحل سمندر پر سخت ہوا میں وہ کانپ رہی تھی۔ "وہ بیمار ہے۔ اُف! اس کے بچے، حالانکہ وہ صرف دو ہیں لیکن پھر بھی ان کی پرورش، بیوہ اور غریب ماں کے لئے کس قدر مشکل ہے"۔ اس نے دوبارہ دستک دی اور پکار کر کہا۔ "بہن! سنتی ہو؟ دروازہ کھولو۔ بی ہمسائی" جواب میں وہی ہیبتناک خاموشی اور بس! اس نے ایک بار اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا جو اس بار خود بخود کھل گیا وہ اندر داخل ہوگئی اس کی لالٹین نے تاریک اور خاموش جھونپڑی کو روشن کر دیا۔ اسکی چھت متعدد مقامات سے بُری طرح ٹپک رہی تھی۔ جھونپڑی کے دوسرے سرے پر ایک عورت کا غیر متحرک جسم پڑا تھا۔ اسکی آنکھیں پتھرائیں ہوئی تھیں اور سرد بازو گھاس کے بستر پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ مرچکی تھی۔ کبھی وہ قوی اور خوشحال عورت ہو گی۔ لیکن اسوقت وہ صرف ایک بے جان جسم تھا۔ جو انسان کی دنیا کے ساتھ طویل جنگ کے بعد باقی رہ جاتا ہے۔

گھاس کے بستر کے قریب دو چھوٹے چھوٹے بچے جھولے میں پڑے خوابوں کی دنیا میں مسکرا رہے تھے۔ ان کی ماں نے جب یہ محسوس کیا کہ اب اس کا دم واپسین قریب ہے تو ان پر چادر ڈالدی تاکہ وہ گرم رہیں اور خود ہمیشہ کے لئے سرد ہوگئی۔

وہ اپنے بوسیدہ جھولے میں کیسی میٹھی نیند سو رہے تھے۔ ان کے ہلکے ہلکے سانس اور ننھے ننھے چہروں سے ایک عجیب سکون اور اطمینان ظاہر ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان معصوم یتیموں کو اس خوابِ خرگوش سے کوئی بیدار نہیں کرسکتا۔ باہر بارش انتہائی شدت سے ہو رہی تھی اور سمندر

خطرے کے گھنٹے کی طرح فضا میں آوازیں بلند کر رہا تھا۔ بوسیدہ چھت کے ایک سوراخ سے پانی کا ایک قطرہ لاشر کے چہرے پر ٹپکا اور آنسوؤں کی صورت میں رخسار پر بہہ گیا۔

مردہ بیوہ کی جھونپڑی میں ماہی گیر کی بیوی کیا کرتی رہی ؟ وہ اپنے دامن میں کیا چیز چھپائے لے جا رہی تھی ؟ اس کا دل کیوں دھڑکنے لگا ؟ وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے بسرعت تمام حتیٰ کہ مڑ کر دیکھے بغیر اپنی جھونپڑی کی طرف کیوں لپکی ؟ اس نے اپنی مسہری کے نیچے کیا چھپایا ؟ آخر وہ کیا چیز چرا کر لائی۔

جب وہ اپنی جھونپڑی میں پہنچی تو سمندر کے اوپر جھکی ہوئی چٹانوں پر سفیدی نمودار تھی وہ مسہری کے قریب ایک آرام کرسی پر دراز ہو گئی اس کا چہرہ زرد تھا گویا وہ کسی جرم کے ارتکاب میں ہراساں تھی تکیہ پر سر رکھے ہوئے تھوڑے وقفہ کے بعد خود ہی بڑبڑانے لگی جھونپڑے کے باہر وحشی سمندر سرد آہیں بھر رہا تھا۔

"میرے غریب شوہر ... . او خدا ! ــــــ نہ جانے وہ کیا کہیں گے !"

وہ خود اپنی مشکلات میں گرفتار ہیں۔ بیٹھے بٹھائے یہ کیا کیا۔ پانچ بچے ہمارے اپنے ہی ہیں ان کے رات دن افکار میں مبتلا رہتے ہیں۔ گویا ان کی تکالیف کم تھیں جو میں نے یہ نئی مصیبت مول لی۔ وہ یقیناً بہت خفا ہوں گے۔ کیا وہ آ گئے ؟ نہیں۔ ذرا سی آہٹ سے مجھے ان کا گمان ہوتا ہے ان کی آمد سے مجھے خوف سا محسوس ہوتا ہے۔ وہ خیالات میں کھوئی ہوئی سردی سے کانپتی رہی۔ ماہی خور پرندوں کی روح فرسا چیخوں اور ہوا کی ہیبتناک سرسراہٹ نے اس پر کچھ اثر نہ کیا۔ یکبار دروازہ کھل گیا صبح کی سفید روشنی کے ساتھ ماہی گیر اپنا جال گھسیٹتا اور مترنم آواز میں گنگناتا ہشاش بشاش اندر داخل ہوا۔ بے شمار مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح اسکی آواز جھونپڑی میں گونج گئی۔ "تم آ گئے ؟" ۔ ماہی گیر کی بیوی بچھڑے ہوئے دوست کی طرح اس سے لپٹ گئی۔ اور اپنا سر اس کے سینے کے قریب پھٹی ہوئی قمیص پر رکھ دیا۔ "میں آ گیا ہوں جانِ من !" اس نے مسکرا کر کہا۔ آگ کی روشنی میں اس کے مطمئن چہرے سے نجابت ٹپکتی تھی۔ جسے اسکی بیوی کتاب کے ورق کی طرح پڑھ سکتی تھی۔

"موسم کیسا تھا !" "نہایت خطرناک" اور شکار" "بہت برا" خیر کوئی بات نہیں۔ میں صحیح و سلامت تمہارے پاس ہوں یہی بہت ہے۔ شکار بالکل نہ ہو سکا بلکہ جال بھی پھٹ گیا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں شیطان رقص کر رہا ہے۔ اور موجوں پر موت کروٹ لے رہی ہے۔ ایک بار تو مجھے یقین ہو چکا تھا کہ کشتی ڈوب کر ہی رہیگی لیکن میں بچ گیا۔ کیونکہ تم جانتی ہو کہ میری جان ان بال بچوں

میں اٹکی ہوئی ہے مجھے اُن کی پرورش کرنا ہے، بہرحال یہ تو بتاؤ کہ اس وقت تک تم کیا کرتی رہی ؟" اسکی بیوی نے جسم میں ایک کپکپی سی محسوس کی ۔ "میں !" اس نے بمشکل کہا ۔ "کچھ نہیں یونہی حسبِ معمول کپڑے سیتی رہی اور طوفان زدہ سمندر کا شور سنتی رہی ۔"

"ہاں بارش کے دن بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں ۔ خیر جانے دو ان باتوں کو" ماہی گیر کی بیوی نے کہا ۔ "بی ہمسایہ کا انتقال ہو گیا ۔ غالباً رات کے پہلے حصے میں تمہارے جانے کے بعد ہی دو بے بس بچے چھوڑ گئی اس کا لڑکا گھٹنوں چلتا ہے اور لڑکی ابھی بہت چھوٹی ہے ۔ غریب بیوہ ! بیچاری نے بہت مصیبتیں جھیلیں ۔" ماہی گیر ہراساں نظر آنے لگا ۔ اس نے اپنی بھیگی ہوئی ٹوپی کو ایک کونے میں پھینکا اور سر کھجلاتے ہوئے کہا ۔ "ہمارے اپنے ہی پانچ بچے پہلے سے موجود ہیں اب دو مل کر سات ہو جائیں گے گھر کا یہ حال ہے کہ اس ناقابل برداشت موسم میں بھی بھوکا سونا پڑتا ہے ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس کا نتیجہ کیا ہوگا ۔" "اوں ۔ اس میں میرا کیا قصور یہ سب خدا کا کام ہے ۔ اس نے ان بیچاروں سے ان کی ماں کو یوں چھین لیا خدا کی مصلحتوں کو سمجھنا میرے لئے دشوار ہے ۔ شاید یہ پڑھے لکھے فلسفی کچھ سمجھ سکتے ہوں گے ۔ ننھے ننھے لاوارث بچے ۔ بی بی دیکھو اسی وقت جاؤ اور انہیں اٹھا لاؤ جلدی کرو وہ جاگ اٹھیں گے تو اپنی ماں کی لاش دیکھکر سہم جائیں گے ۔ ہم انہیں اپنے بچوں کے ساتھ پال لیں گے ۔ وہ بھی ان میں بھائی بہنوں کی طرح رہیں گے ۔ جب خدا ہمارے بچوں کے ساتھ ان دو ننھی ننھی جانوں کا اضافہ دیکھے گا تو یقیناً دستِ غیب سے ہمارے شکار میں اضافہ کرے گا ۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں فاقوں میں بسر کر لونگا ، اُن کے لئے میں آیندہ دُگنی محنت سے کام کرونگا ۔ بس بس جلدی کرو انہیں فوراً اُٹھا لاؤ ۔ تم جاتی کیوں نہیں ۔ سوچ کیا رہی ہو ؟ تم تو عموماً جلد بازی سے کام کرنے کی عادی ہو پھر یہ پس و پیش کیسا ۔ جاؤ ؟"

ماہی گیر کی بیوی نے مسہری سے پردہ سرکا دیا ۔ "دیکھئے !" اس نے کہا ۔

(ترجمہ)

بشیر احمد جمیل
سال دوم

ہندوستان کی مُشترکہ زبان

اس دَور میں جہاں ہندوستانی اور اور اختلافات کی بنا پر جماعتوں میں بٹ رہے ہیں وہاں ہندوستان کی قومی زبان کا سوال بھی فرقہ بندی کا موجب بن رہا ہے۔ کوئی ہندی کو ہندوستان کی قومی زبان کہتا ہے۔ اور کوئی اُردو کو یہاں کی مشترکہ زبان ہونے کا حق دار ٹھہراتا ہے۔ کئی ایسے بھی ہیں جنہیں صوبے میں اپنی صوبجاتی زبان کے سوا کسی اور زبان کا اثر گوارا نہیں۔ تعصبات کی ایسی گرد و غبار میں ہمیں یہ دیکھنے کی کوشش کرنا ہے کہ کون سی زبان ہندوستان کی قومی زبان ہونے کا دعوٰے کرنے میں حق بجانب ہے۔

آئیے سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں کہ اُردو کیونکر وجود میں آئی۔ تاریخ اُٹھا کر دیکھئے۔ "قرون وسطیٰ میں جب ہندوستان میں دو مختلف تمدنوں کی مُٹھ بھیڑ ہوئی تو دیسی کلچر کو غلبہ حاصل ہوا۔ اور بدیسی لوگ بھی دیسی رنگ میں رنگے گئے"۔ یہ پروفیسر جوڈ کی تحقیق ہے جو نہ ہندو ہے، نہ مسلمان اور نہ ہندوستانی ہے اور بھی جو کوئی غیر متعصبانہ نظر تواریخ کے اوراق پر ڈالے گا۔ وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔

اگر ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد و اختلاط کا جذبہ پیدا نہوا ہوتا تو فیضی کو کیا ضرورت تھی کہ سریمد بھگوت گیتا کا ترجمہ کرتا؟ فرحت، خوشتر، تمنا، منور وغیرہ ہندو شاعروں کو کیا پڑی تھی۔ کہ رامائن، مہابھارت اور بہت سی پُرانی کتابوں کے ترجمے اُردو میں کرتے؟ ان کا محرک وُہی اتحاد کا جذبہ اور تہذیبوں کا میل جول تھا۔ جس کا اثر ہم آج تک ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے میں دیکھ سکتے ہیں۔ تہذیب اور معاشرت کے اسی اتحاد و موالات کی پیداوار وہ زبان ہے جسے ہم اُردو کہتے ہیں۔ اُردو وہ چیز ہے جو ہمارے ملک اور قوم کے صدیوں کے میل جول اور تہذیبی لین دین کی یادگار ہے۔ ہم پر اس یادگار کو محفوظ رکھنے ہی کا نہیں بلکہ اسکی ترقی کے لئے کوشاں رہنے کا بھی فرض عائد ہوتا ہے۔ یہ سن کر اگر ایک گروہ یہ کہنے لگ جائے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ تو وہ اس ناقابل تردید حقیقت سے انکار نہیں بلکہ ناواقفیت کا اظہار کرتا ہے۔ کہ "زبانوں کا کوئی بھی مذہب نہیں ہوا کرتا" اسکی مثال دُنیا کے کسی ملک سے ہمیں مل سکتی ہے چین میں کروڑوں مسلمان وہاں کی زبانیں بولتے ہیں۔ لیکن وہاں کی زبان بولتے وقت وہ یہ

ہی کہیں سمجھی جا سکتی ہو۔ اس کا ثبوت جاپانی ریڈیو سٹیشن کے سوا باقی دنیا کے ملکوں کے ریڈیو سٹیشنوں کا اردو میں خاص پروگرام مثلاً برلن۔ لندن۔ انقرہ۔ روم۔ ہمالیہ یا آزاد سٹیشن وغیرہ سے روزانہ اردو میں خبریں نشر کی جاتی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اگر کوئی زبان بھی بین الاقوامی زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے تو وہ اردو ہے۔ یہ کہ اس میں دوسری زبان کے اسما جذب کرنے کی وہ لچک موجود ہے جس سے دنیا کی ہر زبان قطعاً محروم ہے۔ برخلاف اس کے ہندی میں بڑے بڑے لیڈروں کی تقریروں کے مندرجہ ذیل اقتباسات پڑھ کر آپ اندازہ لگائیے کہ غیر ملکی تو رہے خود ہندوستان کے کتنے باشندے انہیں سمجھ سکیں گے۔

"مہاتماجی سنت پوروک ہیں۔ بشیش انوسار مہارشی پرمیھ گیانیشو ہیں۔ پرنتو اجینتک برہوم دوارادہ سنسار دھرشٹی ہو گیہ نہیں۔ مہاتما جیل یاترا اور جیل گھٹنا میں شیمہ رڈ ہوم کرنے میں کچھ موڑی بھی نہیں۔ ......" (تقریر مسٹر سمپورنانندجی۔ جو کہ انہوں نے جیل سے باہر آنے کے بعد گاندھی جی کی پالیسی سے متعلق کی)

"اس سبھا کا سبھا پتیو مجھے دینے کے کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں، تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں ...... میری درشٹی میں تو اوشٹی ہونی چاہئے۔ وغیرہ" (مہاتما گاندھی ۱۹۳۶ء)

"سبھاپتی مہاشے اور متر و۔ آپ نے "آگامی ورش کے اکھل بھارت درش راشٹر یے مہاسبھا کا۔ ادھکشن نرواچت کر میرا جو سمان کیا ہے۔ وغیرہ" (سوبھاش بابو بحیثیت صدر کانگریس ۱۹۳۸ء)

آپ ہی کہئے کہ آسانی۔ ضروری۔ اخبار۔ علاوہ۔ امید۔ عمر۔ شروع۔ فتح۔ سپاہی۔ خوش۔ تعلیم۔ آمدنی اور ختم جیسے عام فہم الفاظ کی جگہ سرلتا۔ آویشک۔ سماچار پتر۔ اتریکت۔ آشا۔ آیو۔ آرتبھ۔ وجے۔ سینک۔ پرسن۔ شکشا۔ آئے۔ سماپت جیسے بھاری بھرکم اور غیر مانوس الفاظ کا استعمال کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

یہ سبھی کچھ لکھ چکنے کے بعد میں صوبائی زبانوں کی طرف آتا ہوں۔ ذرا پنجابی ہی کو لے لیجئے (اس کے سوا مجھے اور کوئی آتی بھی نہیں) اردو میں آپ اگر کہیں "اسے پکڑ لو" تو کیا مجال کہ ہندوستانی یا غیر ملکی کوئی بھی اردو سمجھنے والے کو مقصد سمجھنے میں ذرا بھر دقت ہو۔ برخلاف اس کے پنجابی میں اسی دو لفظی جملے کی یوں گت بنے گی "اینوں پھڑ لو" "اسینوں پھڑ لو"۔ "اینوں پھڑلو" "اینوں نپ گھن" "اسینوں نپڑ گھن" "ایھوں پگڑ لو" "اینوں تھم لو" وغیرہ۔ اب پنجاب ایجوکیشن رپورٹوں کے چند اقتباسات سن لیجئے:۔

"۱۸۵۵ء میں کورٹ آف ڈائرکٹرز نے لنڈن سے اپنے ایک مراسلے میں لکھ بھیجا کہ پنجابی زبان کا

برقرار رکھنا یا اس کے انحطاط کو روکنا ٹھیک نہیں۔ پنجاب اور دوسرے صوبوں میں جو کم پایہ بولیاں بولی جاتی ہیں۔ اُردو اُن پر فوقیت رکھتی ہے۔ لہذا پہلے تعلیم یافتہ لوگوں کو اس سے آشنا کرنا چاہیئے۔ بعد میں عوام الناس پر خود بخود اس کا اثر پڑے گا۔ (رپورٹ بابت سنہ ۸۲-۱۸۸۱ء صفحہ ۲۷، ۳۸ پیرا ۹۱) اُردو بڑی تیزی سے عوام میں پھیل رہی ہے... (رپورٹ سنہ ۸۲-۱۸۸۱ء صفحہ ۳۸ پیرا ۹۳) لوگوں کو ان کی اپنی زبان میں تعلیم دینا ضروری تھا۔ اور اُردو انکی اپنی زبان ہے۔ دیہات کے سکولوں اور تحصیل کے سکولوں میں اُردو کے ذریعہ ہی تعلیم دی جاتی ہے ... (رپورٹ سنہ ۵۶-۱۸۵۵ء صفحہ ۱۰ پیرا ۶۹)۔ اس صوبے میں بہت سی بولیاں ہیں۔ پس اگر ہم لوگوں کی اصلی مادری زبان میں تعلیم دینا چاہیں تو ہمیں ایک نہیں کئی بولیوں الگ الگ تعلیم دینی پڑے گی۔ بیس برس ہوئے انگلستان اور سکاٹلینڈ میں بھی یہی حالت تھی۔ لیکن کبھی کسی نے یہ تجویز پیش نہیں کی۔ کہ مختلف بولیوں کو برقرار رکھا جائے۔ حالانکہ سکاٹلینڈ کی زبان میں وہ ادبی خوبیاں موجود ہیں۔ جن سے پنجابی قطعاً محروم ہے .... (رپورٹ سنہ ۸۲-۱۹۸۱ء صفحہ ۳۹ پیرا ۹۸)

پنجابی بھی باقی صوبائی زبانوں کی ہم رتبہ ہے۔ جہاں ایک اُردو کے مقابلے میں نہیں ٹھہری۔ وہاں کوئی دوسری بھی نہیں ٹھہر سکتی۔

یہ عرض کرنا بھی اسوقت بے جا نہ ہوگا۔ کہ پہاڑوں دریاؤں اور سمندروں کی حد بندی ہندوستان کو ناقابلِ تقسیم نہیں بنا سکتی۔ آپ اگر اکھنڈ ہندوستان چاہتے ہیں۔ تو پہلے سب دلوں کو اکھنڈ بنا لیجئے۔ پھر ایک کیا لاکھ پاکستان بھی ہندوستان کو تقسیم نہیں کر سکتے۔ سب دل تو جب اکھنڈ ہو سکتے ہیں۔ جبکہ کوئی مشترکہ قومی زبان ہو۔ لہذا سب سے پہلا قدم جو آپ کو "اکھنڈ ہندوستان" کی طرف اُٹھانا چاہیئے وہ باقی سب زبانوں کی متعصبانہ حمایت چھوڑ کر اپنی قومی زبان اُردو کی حمایت اور خدمت کرنا ہے۔ اس کا کہیں یہ مطلب نہیں کہ میں باقی زبانوں کی ترقی کا دشمن ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں سبھی زبانوں کی ترقی۔ جس قدر بھی وہ اپنی اپنی جگہ کر سکیں، چاہتا ہوں۔ لیکن میں کسی زبان کو ہندوستان کی قومی زبان اُردو پر جارحانہ حملہ کرتے دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ ہندی پیاری پیاری میٹھی زبان ہے۔ بنگالی اس سے بھی زیادہ میٹھی اور مہذب بولی ہے۔ پنجابی میری مادری بولی ہے۔ میں ان سب زبانوں کا خیر خواہ اور ہمدرد ہوں۔ مگر اُردو ان سب سے زیادہ اہم زبان ہے کیونکہ یہ زبان ہم سب ہندوستانیوں کو اکٹھا کر سکتی ہے۔ بکھرے ہوئے دانوں کو تسبیح کے رشتے میں پرو سکتی ہے!

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

(محمد شفیع رول نمبر ۴۶۳ - سالِ اوّل)